اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الحمدللہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ

امابعد

محترم قارئین کرام!

شاید ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جہاں امت کا کتاب سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اردو میں روزانہ نئی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر آ رہی ہیں اور معتدبہ تعداد ایسی بھی ہے جس نے کتاب سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نئی ٹیکنالوجی نے جہاں ہمیں سہولت پسند بنا دیا ہے وہاں اس نے ہم سے مطالعہ کی عادت چھین لی ہے۔

اسماء الحسنیٰ کے سلسلے میں یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی بلکہ تمہید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی ہے کہ اس موضوع پر سلسلہ وار دروس اور بعد ازاں مضامین تیار کروں۔ یہ مضامین ہفتہ وار روشنی کی زینت بنتے رہے ہیں۔ دوستوں کے مشورے سے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ بھی تھا تاہم اب اسے ''ای بک'' کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جہاں روایتی کتاب کی اشاعت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے وہاں نئے دور میں ''ای بک'' کو پسند کرنیوالوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دعا کریں کہ اس سلسلے کی دوسری کتاب بھی جلد تیار ہو کر منظر عام پر آ جائے۔

 اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو ہمارے لئے نافع اور عمل پر ابھارنے والا بنائے۔ آمین۔

عبدالستار خان

جدہ۔ 31 دسمبر 2011ء

nazar_70@hotmail.com

تمہید

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُواْ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَآئِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴾

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔'' (1)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و برتری، اس کے تقدس اور پاکیزگی اور اس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار ہوتا ہے، آیت مذکورہ میں ''الحاد'' کا لفظ استعمال کیا گیا جس کے معنی ہیں وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں: **الحد السهم الهدف** یعنی تیر نشانے سے ہٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام دیئے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں یا جن سے اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو'' (2)

....

(1) الاعراف 180

(2) تفہیم القرآن: سورۃ الاعراف، حاشیہ 142۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا علم کیوں ضروری ہے؟ اس لئے کہ ''تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور اس تصور کی صحت و درستی تعلق کی صحت و درستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے'' (3)

انسانی وجود کے 3 پہلو قابل غور ہیں، روح، نفس اور جسم۔ روح انسانی وجود کا علوی پہلو ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِن رُّوحِیْ ﴾

''اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی''۔ (4)

روح انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے قائم کرتی ہے، اسی لئے اسے امر ربی کہا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَيَسْأَلُونَکَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّیْ ﴾

''یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو یہ روح امر ربی ہے''۔ (5)

روح انسان کو بلندیوں کی طرف کھینچتی ہے بلکہ وجودِ انسانی میں روحِ خداوندی ہی انسانیت کا حقیقی شرف ہے۔

جسم مٹی سے بنا ہے لہذا اس کا رجحان ہمیشہ زمین کی طرف رہا ہے۔ وجودِ انسانی میں جسمانی تقاضے وجود کا سفلی (پست) پہلو ہیں۔ زن، زر اور زمین کی محبت اسی وجود کے کرشمے ہیں جبکہ نفس ان دونوں کے درمیان ہے۔ نفس کا ایک حصہ روح کے تقاضوں پر مبنی ہے، یعنی بلندیوں کی طرف مائل ہے جبکہ دوسرا حصہ حیوانی تقاضوں پر مبنی ہے اور پستیوں کی طرف مائل ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ

....

(3) ایضا۔

(4) الحجر 29

(5) الاسراء 85

نے نفس میں اچھائی اور برائی دونوں رکھ دیئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴾

''اس نے نفس انسانی میں فجور اور تقویٰ دونوں رکھ دیئے ہیں''۔(6)

گویا نفس میں روح اور جسم، دونوں کے تقاضے جمع کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ نفس کے کون سے تقاضوں کو جلا دیتا ہے۔ اگر وہ حیوانی وجود کے زمینی تقاضوں کو پورا کرنا اپنا مقصدِ حیات بنالیتا ہے تو وہ اپنی روح کو گھائل کرتا ہے، مادی اور شہوانی تقاضوں کا غلبہ بالآخر اسے حیوانات بلکہ ان سے بھی بدتر درجے پر گرا دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ﴾

''پھر ہم نے اسے پست ہونے والوں کے پست ترین درجے کی طرف لوٹا دیا''(7)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴾

''یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر''۔(8)

نفس کے حیوانی تقاضوں پر قابو نہ پانا ہی اصل ناکامی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ﴾

''اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے اسے دبایا''۔(9)

....

(6) الشّمس 8

(7) التین 5

(8) الاعراف 179

(9) الشّمس 10

اس نفس کی اصلاح کیلئے بھی اسماء الحسنٰی کا علم بہت ضروری ہے۔

توحید اور اس کی حقیقت کو جاننے کیلئے ضروری ہے کہ اسماء الحسنٰی کا علم حاصل کیا جائے۔توحید کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات اور صفات میں یکتا سمجھنا اور اس کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرانا۔توحید اور اس کی اقسام کو سمجھے بغیر دین کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ بات معروف ہے کہ توحید کی تین اقسام ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

توحید الوہیت:

بندے کے تمام افعال اللہ کیلئے خالص ہوں، عبودیت، اطاعت اور عجز و نیاز کے جتنے کام ہیں سب اللہ وحدہ لاشریک کے لئے خالص کردیئے جائیں جن میں سجود ورکوع ونذر و نیاز ودعا وغیرہ شامل ہیں۔

توحید ربوبیت:

اللہ کو اس کے تمام افعال میں ایک مانا جائے۔افعال میں تخلیق اور تدبیر ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور نظام چلانے اور تدبیر کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

توحید اسمائے صفات:

اللہ کے تمام بابرکت نام اور صفات جو قرآن وسنت میں ثابت ہیں ان کو بغیر کسی تحریف، تعطیل، تشبیہ اور تمثیل کے تسلیم کرنا۔اس کی کوئی مثال ہے نہ اس کو تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

امت کی موجودہ پستی، ذلت ورسوائی کا علاج اسمائے حسنٰی کے علم میں ہے۔اسماء وصفات تمام مسائل کے حل کی اصل اور بنیاد ہے۔یہی مجرب علاج اور نسخۂ شافی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّهُ لاَ يَهْدِيْ الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ﴾

’’پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس

کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات گگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری''۔(10)

علامہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

''جو اپنی عمارت کو بلند کرنا چاہتا ہے اسے بنیاد مضبوط کرنی پڑے گی کیونکہ عمارت کی بلندی کا تعلق اس کی بنیاد کی مضبوطی سے ہے۔کمزور بنیاد پر عمارت قائم ہوگی تو گر جائے گی لہذا مومن کو چاہئے کہ اپنی عمارت ایمان کی بنیاد پر رکھے۔اس لئے مومن کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، پہلا اللہ تعالیٰ کی اس کے اسماء وصفات کے ذریعہ صحیح معرفت اور دوسرا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت''۔(11)

حضرت مالک بن دینارؒ نے فرمایا:

''دنیادار اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ ان کو دنیا کی سب سے لذت دینے والی چیز کا ذائقہ نصیب نہیں ہوا''

پوچھا گیا: وہ کیا ہے؟''

فرمایا:

''اللہ کی معرفت''(12)۔

علامہ ابن قیم کہتے ہیں:

''بندوں کی سعادت وصلاح وفلاح اس میں ہے کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کریں کہ اصل مقصود ومطلوب ہے جس کے بغیر ان کا حال چوپائیوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا''۔(13)

....

(10) التوبہ 109

(11) الفوائد 175

(12) حلیۃ الاولیاء: ابو نعیم، 358/2

(13) مختصر الصواعق المرسلۃ، 47/1

قرآن مجید کی عظیم تر آیت، آیت الکرسی ہے جس میں اللہ کے 6 نام آئے ہیں۔

ام القرآن سورہ فاتحہ کو کہتے ہیں جس میں اللہ کے اسمائے حسنٰی کا ذکر ہے۔

سورہ الاخلاص قرآن کی ایک تہائی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس صحابی کو جنت کی بشارت دی تھی جو سورہ اخلاص کو محبت کی بنا پر پڑھا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک صحابی نماز میں ہمیشہ سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے، رسول اکرم ﷺ کو ان کے بارے میں بتایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان سے پوچھو وہ کیوں اس طرح کرتے ہیں''

ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا:

''مجھے اس سورہ سے محبت ہے کیونکہ اس میں اللہ کی صفات کا ذکر ہے''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''انہیں خوشخبری دو کہ اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے''(14)۔

قرآن مجید میں اسماء الحسنٰی کا ذکر 4 مرتبہ آیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

''(اے نبی ﷺ) ان سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کیلئے سب اچھی ہی نام ہیں''۔(15)

﴿ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

''وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کیلئے بہترین نام ہیں''۔(16)

....

(14) بخاری و مسلم

(15) الاسراء 110

(16) طٰہٰ 8

﴿ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

''وہ اللہ ہی ہے تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے، اس کیلئے بہترین نام ہیں''۔(17)

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُواْ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَآئِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴾

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے''(18)۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ تمام علوم میں اسمائے حسنیٰ کا علم سب سے افضل و بہتر ہے۔

علامہ ابن عربیؒ کہتے ہیں:

''علم کی فضیلت کا تعلق اس چیز سے ہے جس کے بارے میں معلوم کیا جائے اور اللہ کے اسماء کا علم اس لئے سب سے زیادہ فضیلت والا ہے کیونکہ اس کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے''۔(19)

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا اور ان کا علم حاصل کرنا نیز ان اسماء سے دل لگانا دراصل فلاح تک پہنچانے والا راستہ اور صراط مستقیم ہے۔ انہی اسماء سے راستے کے مسافروں کی عزیمت جوان رہتی ہے اور حوصلے بلند رہتے ہیں۔ مسافر کو راستے میں سنگ میل کی ضرورت ہے اور سنگ میل کے بغیر آدمی سفر نہیں

....

(17) الحشر 24

(18) الاعراف 180

(19) احکام القرآن: علامہ ابن عربی، 804/2

کر سکتا لہذا صراط مستقیم کے سنگ میل یہی اسمائے حسنیٰ ہیں جو منزل مقصود تک لے جاتے ہیں''۔(20)

علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

''اسمائے صفات کا علم ہدایت کی بنیاد، دلوں کا حاصل، عقل کا محور اور عمل کا محرک ہے''۔(21)

علامہ ابن تیمیہؒ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

''اللہ کی معرفت، معارف کا حاصل ہے، اس کی عبادت اصل مقصد ہے اور اس تک رسائی اصل مطلوب ہے۔ یہی انبیاء کی دعوت کا خلاصہ اور رسالت کا مغز ہے''۔(22)

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''تمام انبیاء کی دعوت تین بنیادی نکات پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تعارف جسے اس کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ پکارا جائے، دوسرا اس تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ جو ذکر، شکر، عبادات اور اس کی محبت پر مبنی ہے اور تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی اور راستے پر چلنے کا نتیجہ بندوں کو بتایا جائے کہ وہ اپنے نیک بندوں کے لئے کتنا عظیم اجر اپنے پاس رکھتا ہے''۔(23)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء ﴾

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں''۔(24)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

....

(20) مدارج السالکین: علامه ابن قیم، 110/1

(21) الفتاویٰ الحموية: علامه ابن تيميه، 196

(22) الفتاویٰ الحموية: ابن تيميه، 199

(23) الصواعق المرسلة: علامه ابن قيم، 1489/4

(24) فاطر 28

''اللہ سے ڈرنے والے لوگ صرف وہی ہیں جو اللہ کا علم رکھتے ہیں کیونکہ علم جتنا گہرا ہوگا اس سے خشیت بھی اتنی ہی ہوگی''(25)۔

قرآن مجید کی بیشتر آیات میں اس علم کے سیکھنے کی اہمیت واضح ہوئی ہے۔ درج ذیل ارشادات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

*''خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے''(26)

*''جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے''(27)

*''جان لو کہ اللہ بردبار اور درگزر کرنے والا ہے''(28)

*''خوب جان رکھو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے''(29)

*''تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے''(30)

اس مفہوم اور معنی کی 30 کے قریب آیات ہیں۔

اسمائے حسنیٰ کا علم دل کو شرک وشک اور شبہات اور بدعات سے پاک کرتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''شریعت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بدنی اعمال کا تعلق قلب سے ہے اور قلبی اعمال بدنی اعمال سے زیادہ اہم ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ مومن اور منافق میں فرق دل ہی تو ہے جبکہ دونوں کی نماز

....

(25) تفسیر ابن کثیر 553/3

(26) البقرہ 231

(27) البقرہ 233

(28) البقرہ 235

(29) البقرہ 244

(30) البقرہ 267

اورعبادات ایک جیسی ہیں‘‘ (31)۔

علامہ عزبن عبدالسلام کہتے ہیں:

’’دل جب اللہ تعالیٰ کے صفات کمال وجلال کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے اندر تزکیہ پیدا ہوتا ہے اور جب اس کے اندر تزکیہ پیدا ہوتو وہ بدن کو حکم دیتا ہے کہ وہ اعمال کئے جائیں جو شان الٰہی کے مطابق ہوں‘‘۔(32)

سلف صالحین میں سے کسی سے پوچھا گیا:

’’کیا دل بھی سجدہ کرتا ہے؟‘‘

فرمایا’’ہاں! دل بھی سجدہ کرتا ہے مگر جب وہ سجدہ کرتا ہے تو مرتے دم تک سجدے سے نہیں اٹھتا‘‘ (33)۔

اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ اللہ کی عبادت کرنے اور اس پر تدبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

’’دل اللہ تعالیٰ کی محبت کیلئے ہی پیدا ہوا ہے، یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ نے اپنی محبت دلوں میں ودیعت کردی ہے، انسان فطرتاً اللہ سے محبت کرتا ہے، فطرتِ انسانی مداخلت کے بغیر رہے تو خود بخود اللہ تک پہنچ جاتی ہے‘‘ (34)۔

ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

’’جس کا دل اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی ایک اسم سے لگ گیا تو وہ اسم اس کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کی

....

(31) بدائع الفوائد: ابن القیم، 193/3

(32) شجرۃ المعارف: العز بن عبد السلام

(33) التعبد بالاسماء والصفات: ولید الودعان

(34) مجموع الفتاویٰ: ابن تیمیہ، 134/10

جناب میں اسے لے جائے گا اور جو اسمائے حسنیٰ کے راستے پر چلا وہ اللہ تعالیٰ تک ضرور پہنچے گا، جس نے اس سے محبت کی وہ یقیناً اس کے اسمائے صفات سے محبت کرے گا'' (35)۔

رسول اکرم ﷺ کی دعا تھی:

اللھم انی اسألک حبک وحب کل من یحبک وحب کل عمل یقربنی الی حبک

''اے اللہ میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں، ہر اس چیز سے محبت کا سوال کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہو اور ہر اس عمل سے محبت کا سوال کرتا ہوں جو تیری محبت سے مجھے قریب کر دے'' (36)۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے عجز وانکساری اور تذلل پیدا ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین میں سے کسی نے کہا:

''اللہ تک پہنچنے کے لئے تمام عبادات کے دروازوں پر گیا تو دیکھا ہر دروازے پر لوگوں کی بھیڑ ہے جس کے باعث مجھے دروازہ میں داخل ہونا مشکل ہو رہا تھا اور جب میں عجز وانکساری اور تذلل کے دروازے پر گیا تو دیکھا کہ یہ بڑا وسیع اور کشادہ دروازہ ہے جس پر لوگوں کی بھیڑ نہیں۔ ابھی میں نے چوکھٹ پر قدم ہی رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا اور مجھے اپنے دربار میں لے گیا''۔(37)

اسمائے حسنیٰ کا علم انسان کے اندر دعا اور قبولیت کی امید پیدا کرتا ہے۔ دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے تمام صفات کا یقین رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اللہ غنی ہے کیونکہ فقیر سے نہیں مانگا جاتا، وہ سننے والا ہے کیونکہ بہرے کو نہیں پکارا جاتا، وہ کریم ہے کیونکہ بخیل سے نہیں کہا جاتا، وہ رحیم اور شفیق ہے کیونکہ سنگ دل سے سوال نہیں کیا جاتا، وہ قدرت رکھتا ہے کیونکہ عاجز اور بے بس سے طلب نہیں کیا جاتا۔

....

(35) عدۃ الصابرین: ابن قیم، 286

(36) ترمذی، علامہ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

(37) مدارج السالکین: ابن قیمؒ، 461/1

اللہ تعالیٰ کی معرفت سے اطاعت اور عبادت میں لذت پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ مشکل اور پریشانی کے وقت فرمایا کرتے تھے:

''اے بلال نماز قائم کر کے ہمیں راحت پہنچاؤ''۔(38)

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

''بے شک اللہ کے 99 نام ہیں، ایک کم سو، جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''(39)

عربی متن میں ''احصاء'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، احصاء کا مطلب صرف یاد کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انہی ناموں کے توسط سے کرنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں ''یہی سعادت اور خوش بختی کا اصل الاصول ہے۔''(40)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ سعدیؒ لکھتے ہیں:

''جنت میں صرف مومنین ہی داخل ہوں گے، ایمان کا سرچشمہ، مصدر و منبع اور جڑ و بنیاد اسمائے حسنیٰ ہیں اور انہی کی طرف ایمان پلٹ کر آتا ہے''۔(41)

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''جسے ابدی سعادت درکار ہو اسے عبودیت کی چوکھٹ سے چمٹے رہنا چاہئے''(42)

علامہ ابونعیم کہتے ہیں ''احصاء کا مطلب گنتی یاد کرنا نہیں بلکہ عمل اور ایمان ہے۔''

....

(38) ابو داؤد، علامہ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(39) بخاری و مسلم

(40) بدائع الفوائد۔ ابن قیم

(41) التوضیح والبیان۔ علامہ سعدیؒ

(42) مدارج السالک۔ ابن قیم

اللہ کے رسول ﷺ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے محض 99 نام ہیں۔اللہ کے رسول ﷺ کی معروف دعا ہے:

’’یا اللہ میں تجھ سے تیرے ہر نام کے واسطے سے سوال کرتا ہوں، جو نام تو نے اپنی ذات کے بیان کئے ہیں یا اپنی کتاب میں نازل فرمادیئے یا اپنے کسی بندے کو بطور خاص سکھادیئے یا جن ناموں کو تو نے اپنے خزانۂ غیب میں محفوظ رکھا ہوا ہے‘‘(43)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے کچھ اسماء ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خزانۂ غیب میں محفوظ کررکھا ہے۔

واضح رہے کہ اسماء الحسنٰی کے متعلق اہل علم نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ان علمی مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے ہم آپ کے سامنے وہ چیز پیش کررہے ہیں جن سے افادہ عام کی توقع ہے۔

(جاری ہے)

نوٹ:

یہ موادتقریر کی شکل میں ڈی وی ڈی میں بھی دستیاب ہے۔

....

(43) احمد، ابن حبان اور حاکم۔ حدیث صحیح

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

اللہ ، الالہ

اسماءالحسنٰی میں سب سے پہلے دوناموں پر روشنی ڈالی جارہی ہے وہ یہ ہیں:

''اللّٰہ''اور''اَلِالٰہ''۔

اللہ تعالیٰ کاارشادہے:

﴿ إِنَّنِیۡ أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكۡرِیۡ ﴾

''میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تو میری بندگی کراور میری یاد کے لئے نماز قائم کر'' (1)

''اللہ'' خالق کا خاص اور ذاتی نام ہے جو سب سے بڑا اور جامع ہے۔ یہ اسم تمام اسمائے حسنیٰ میں سب سے زیادہ شان والا ہے، اسی لئے اسے اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ مخلوق میں اس جیسا کسی کا نام نہیں، اس لئے اس اسم کی کوئی تثنیہ ہے نہ جمع اور نہ ہی اس کی تانیث (2)۔ یہ اسم اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی جو ازل سے ابد تک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

''انسان کے جملہ اعمال وافعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ ہوں، مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے متحرک بن جائے۔

....

(1) طہٰ 14

(2) تثنیہ دو کو کہتے ہیں مثال کے طور پر کریم کا تثنیہ ہے کریمان، اس کی جمع ہے کرماء اور اس کی تانیث سے مراد اس کا مؤنث جیسے کریمہ۔

دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہوجائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی زیادہ مرتب، منظّم اور قابل اعتماد ہوگی''(3)۔

اس نام کے مصدر اور اصل کے متعلق علمائے کرام کے درمیان بڑی بحث ہے تاہم اکثریت کا خیال ہے کہ اسم ''اللہ'' کا اصل ''الٰہ'' ہے اور ''الٰہ'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَإِلَـهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لاَّ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴾

''تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں''(4)۔

اس لفظ کا مادہ ''ا ل ہ'' ہے۔ اس مادے سے جو الفاظ لغت میں آتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

☆اَلِهَ : حیران وسرگشتہ ہوا۔

☆الهت الی فلان ای سكنت اليه : اُس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون حاصل کیا۔

☆اله الرجل ياله ، اذا فزع من امر نزل به فالهه غيره ای اجاره : آدمی کسی مصیبت یا تکلیف سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اس کو پناہ دی۔

☆اله الرجل الی الرجل ای اتجه اليه لشدة شوقه اليه : آدمی نے دوسرے کی طرف شدتِ شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

....

(3) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

(4) البقرہ 163

☆**اله الفصيل اذا ولع بامه :** اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہیں اس سے چمٹ گیا۔
☆**لاہ یلیہ لیہا و لاھااذا احتجبت :** پوشیدہ ومستور ہوا۔(5)

انسان کے ذہن میں عبادت کیلئے اولین تحریک اپنی حاجت مندی سے پیدا ہوتی ہے، وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کرسکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ اس کی حاجت پوری کرسکتا ہے۔

اسے اپنے سے بالاتر سمجھے، نہ صرف رتبے کے اعتبار سے بالاتر سمجھے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی بالادستی کا قائل ہو۔

اس کی طاقت، حاجت روائی اور اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔

اس کی طرف انسان کا اشتیاق سے توجہ کرنا۔(6)

قرآن مجید میں اسم ''اللّٰه'' 2602 مرتبہ آیا ہے(7)۔

تمام اسماء میں یہ نام سب سے زیادہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ الحشر کی آخری آیات، آیت الکرسی اور سورہ المجادلہ کی ایک دو آیات کے علاوہ ہر ہر آیت میں یہ اسم مذکور ہے(8)۔

''اللّٰہ'' عربوں کے لئے اجنبی لفظ نہیں تھا۔ قدیم زمانوں سے وہ خالق کائنات کیلئے یہی لفظ استعمال کرتے تھے اور اپنے دوسرے معبودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لئے ان کے ہاں '' الٰہ'' کا لفظ رائج تھا۔

یہ اسم علم، خاص اور جامد ہے جس کا کوئی اشتقاق نہیں۔ تمام اسمائے حسنٰی اپنے معانی اور مفہوم کے

....

(5) الاسماء الحسنٰی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترتیب: عبدالوکیل علوی، ص33۔

(6) قرآن کی 4 بنیادی اصطلاحات، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص15 تا18۔

(7) الجامع لاسماء الله الحسنیٰ، حامد احمد الطاهر

(8) الاسنی ، الامام القرطبی، ص273

اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے تین ناموں پر مبنی ہیں:

اللہ، الرب اور الرحمٰن۔

انہی تینوں ناموں میں باقی تمام نام سموئے ہوئے ہیں۔

اسم " اللّٰه "، میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ الوہیت موجود ہے۔

اسم الرب میں صفاتِ ربوبیت ہے جبکہ اسم الرحمٰن میں جود واحسان اور بر پنہا ہے۔ یہ تینوں نام سورۃ الفاتحہ میں جمع کیئے گئے ہیں (9)۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ "الرحمٰن، الرحیم، الخالق، العزیز" اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں، یہ نہیں کہا جاتا کہ "اللہ" الرحمٰن الرحیم کا نام ہے (10)۔

اس نام کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام اسمائے حسنیٰ کا اصل ہے اور تمام اسمائے حسنیٰ اس نام سے وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا ﴾

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو" (11)۔

﴿ اللَّهُ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

"وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کیلئے بہترین نام ہیں" (12)۔

﴿ قُلِ ادْعُواْ اللّهَ أَوِ ادْعُواْ الرَّحْمَـنَ أَيّاً مَّا تَدْعُواْ فَلَهُ الأَسْمَاء الْحُسْنَى ﴾

....

(9) مدارج السالکین، الامام ابن القیم

(10) فقه الاسماء الحسنى، عبد الرزاق عبد المحسن البدر، ص 90

(11) الاعراف 180

(12) طه 8

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہہ دو، اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کیلئے سب اچھے ہی نام ہیں'' (13)۔

اس اسم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام اسمائے حسنٰی میں الف اور لام ہونے کی صورت میں حرف ندا داخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر الرحمٰن، القدوس میں جب حرف ندا داخل کیا جائے تو یارحمٰن، یاقدوس کہا جائے گا، یعنی الف اور لام حذف ہوگا جبکہ اللہ میں حرف ندا داخل ہوتا ہے جیسے ''یااللہ''۔

اس مبارک نام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر مسنون اذکار میں اسی نام کا استعمال کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر ''**سبحان الله، الحمد لله، الله اكبر، لاحول ولا قوة الا بالله**''۔

اس کی خصوصیات میں سے ہے کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر اس دنیا کے آخر انسان تک کسی کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرے۔ جاہلیت کے تاریک ترین دور میں بھی لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ نام خالق و مالک کائنات کا ہے، ارشاد باری تعالٰی ہے:

﴿ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴾

''اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے'' (14)۔

اللہ تعالٰی نے اپنے اس نام (اللہ) کو کافروں اور طاغوتوں کے دلوں سے محو کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو اس سے منسوب کریں۔

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں ''تمام اسمائے حسنٰی سے اس اسم کو کچھ خصوصیتیں حاصل ہیں:

اول یہ کہ ''اللہ'' تمام ناموں کی ابتدا ہے، دوم یہ کہ یہ تمام ناموں میں سے عظیم تر ہے، سوم یہ کہ معانی

---

(13) الاسراء 110

(14) لقمان 25

اور مفہوم کے اعتبار سے سب سے زیادہ جامع ہے، چہارم یہ کہ اس نام کے معانی اور مفہوم بے حد وحساب ہیں، پنجم یہ کہ یہ اللہ کا ذاتی نام ہے جبکہ باقی تمام اسماء اس کی صفات ہیں، ششم یہ کہ عقلی اور شرعی اعتبار سے اس نام کا تعلق خاص اللہ تعالیٰ سے ہے۔ ہفتم یہ کہ کسی مخلوق کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرے، ہشتم یہ کہ ہر کام میں برکت کے حصول کے لئے اسے استعمال کیا جاتا ہے، نہم یہ کہ تمام امتوں میں معروف تھا اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اور دہم یہ کہ جب یہ نام زمین سے اٹھ جائے گا تو قیامت برپا ہو جائے گی (15)۔

امام قرطبیؒ کہتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ قیامت برپا کرنا چاہے گا تو زمین میں بسنے والے تمام مومنین کی روحوں کو قبض کر لے گا اور زمین میں باقی رہنے والے فاسقوں اور کافروں کی زبانوں سے یہ نام ''اللہ'' چھین لے گا، اس وقت قیامت برپا ہوگی'' (16)۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لاَ يُقَالَ فِي الْاَرْضِ: اَللّٰه اَللّٰه

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں کوئی ''اللہ، اللہ'' کہنے والا نہیں رہے گا'' (17)۔

علامہ رازی کہتے ہیں:

اس مبارک نام ''اللہ'' کو جو خصوصیتیں حاصل ہیں وہ کسی دوسرے نام کو حاصل نہیں۔ کلمہ شہادت

....

(15) الاسنی، الامام القرطبی، ص 278

(16) الاسنی، الامام القرطبی، ص 275

(17) حدیث صحیح: بروایت حضرت انس بن مالکؓ، دیکھئے: مسلم 148، احمد 12043، ترمذی 2207۔

جس کے ادا کرنے سے آدمی کفر سے اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ اس نام کے بغیر ادا نہیں ہوتا۔ اگر آدمی ''اشھد ان لا الــه الا الـرحـمن، الرحیم، وغیرکہے تو وہ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ ''اشھد الا اله الا الله'' نہ کہے''(18)۔

اسم اللہ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اس میں سے حرف کم کر دیئے جائیں تو اس کا مفہوم تبدیل نہیں ہوتا:

''الف'' نکال دیا جائے تو ''للّٰہ'' ہوگا۔

ایک'' لام'' نکال دیا جائے تو ''اله'' ہوگا۔

دونوں ''لام'' نکال دیئے جائیں تو''ھو'' رہ جاتا ہے۔ اور''ھو'' کا مخرج سینے سے ہے(19)۔

اسم اللہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہی اول اور آخر مطلوب ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُولُوا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

''مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الــه الا الـلــه نہیں کہتے''(20)۔

ایک اور جگہ پر اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَم اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه دَخَلَ الْجَنَّة

''جو اس یقین کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ

....

(18)مفاتیح الغیب، الامام الفخر الرازی

(19)الاسنی، الامام القرطبی، ص280

(20)حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوہریرہ، دیکھئے: مسلم 21، بخاری 2946

جنت میں داخل ہوگا'' (21)۔

جس کام کی ابتدا میں یہ نام نہ لیا گیا ہو وہ بے برکت اور جڑ کٹا ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یَبْدَأُ فِیْهِ بِذِکْرِ اللّٰه فَهُو اَبْتَر

''ہر وہ اہم کام جس کی ابتدا میں اللہ کا ذکر نہ کیا گیا ہو تو وہ جڑ کٹا ہے'' (22)۔

اس نام کا ذکر کم پر کیا جائے تو وہ بڑھ جاتا ہے، خوف میں کیا جائے تو امن مل جاتا ہے، مشکل ومصیبت میں لیا جائے تو اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، تنگی میں لیا جائے تو کشادہ ہو جاتی ہے، غم راحت میں تبدیل ہو جاتا ہے، ذلت عزت میں بدل جاتی ہے اور فقر غنا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نام ہے جس سے برکتوں کا حصول ہوتا ہے، دعائیں قبول ہوتی ہیں اور بلائیں ٹل جاتی ہیں۔

ہم اپنی دعاؤں میں عموماً ''اللّٰھم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟۔

علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ **اللّٰھم** کا مطلب ''یا اللہ'' ہے۔ یہ صیغہ صرف طلب کرنے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے نام کے لئے مستعمل نہیں (23)۔

اللہ تعالیٰ کے ان دو (**الله** اور **الاله**) مقدس اور بابرکت ناموں کے معانی ومفہوم جاننے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ اس حوالے سے مختلف علماء نے مختلف فوائد کا ذکر کیا ہے، چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

''اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ

....

(21) **حدیث صحیح**: براویت حضرت عثمان بن عفانؓ، دیکھئے: مسلم 26، نسائی 10888 تاہم امام نسائی اس کی سند پر کلام کیا ہے۔

(22) امام بیہقی نے سنن الکبری میں 3/209 اور 8/330 میں نیز امام طبرانی الکبیر 72/19 میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے، علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد 2/3148 میں بھی نقل کیا اور فرمایا: اس کے رواۃ میں صدقہ بن عبد اللہ ہے جسے امام احمد، بخاری، مسلم اور دیگر نے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ اسی راوی کو ابوحاتم اور دحیم نے ثقہ کہا ہے۔

(23) **الجامع لاسماء الله الحسنیٰ، حامد احمد الطاهر**، ص 15

اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ہیں، کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، رسولوں پر اس لئے ایمان کے وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کا دن ہے، فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقرر کیا ہے، حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں۔ یہ تمام ایمانیات دراصل ایمان باللہ پر قائم ہیں۔اس ایک چیز کو الگ کردیجئے پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخرت، نہ رسول اتباع کے مستحق ہیں نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہ جاتا''(24)۔

''اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ:

1) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اسے چلا رہی ہے۔

2) اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس کے احکام کے مطابق وسیع کائنات کی تدبیر کر رہی ہیں۔

3) انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی علم و جہالت دونوں کا اس کے اندر اجتماع ہے، غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے اس کی پیروی انسان کرنے لگتا ہے۔

4) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کا خالق خود بنی نوع انسان ہی میں سے ایک بہتر آدمی کو انتخاب کرتا ہے اور اس کو صحیح علم عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کر دیتا ہے۔

5) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسؤل ہستی نہیں۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لئے اپنے

....

(24) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ایک دن اس کو ذرے ذرے کا حساب دینا ہوگا اوراپنے اعمال کے اچھے یا برے نتائج دیکھنے ہوں گے'' (25)۔

''ایمان اپنے اندرزبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے۔عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا وہاں اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین، پیغمبر اسلام ﷺ کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کرسکتا ہے نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم'' (26)۔

اللہ تعالیٰ کے ان دو مذکورہ ناموں کا علم حاصل کرنے سے ہمارے اندر وسعتِ نظر پیدا ہوگی۔ایمان باللہ کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویائے نظر کو اتنا وسیع کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے۔انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے اعتبار سے دیکھتا ہے اس کی نگاہ اس تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے جس میں اس کی اپنی قدرت، اس کا اپنا علم اور اس کے اپنے مطلوبات محدود ہیں۔اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر ٹھہر جاتی ہے۔اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے۔اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

ایمان باللہ انسان کو پستی اور ذلت سے اٹھا کر خودداری اور عزتِ نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔جب تک اس نے اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا تھا دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا ہر ضرر پہنچانے والی

....

(25) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(26) ایضاً

چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا، اس سے خوف کھاتا تھا، اس کے آگے ہاتھ پھلاتا تھا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا مگر جب اس نے اللہ کو پہچانا تو معلوم ہوا جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں، جن کی بندگی وہ کر رہا تھا وہ سب اسی طرح کے بندے ہیں۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے میں خود انکساری کے ساتھ عزتِ نفس اور خشوع وخضوع کے ساتھ ہم رشتہ ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی طاقت کے سامنے بالکل بے بس ہوں۔

خالق اور مخلوق کے تعلق کی صحیح معرفت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان سے ان تمام غلط توقعات اور جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو عدم معرفت کا نتیجہ ہے اور انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ ان کیلئے اعتقادِ صحیح اور عملِ صالح کے سوا فلاح ونجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔

ایمان باللہ انسان میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکست دلی سے معلوم نہیں ہوتی۔ مومن کیلئے ایمان امیدوں کا ایک لازوال خزانہ ہے جس سے قوتِ قلب اور تسکینِ روح کی دائمی اور غیر منقطع رسد اس کو پہنچتی رہتی ہے۔

یہی رجائیت، صبر اور استقامت اور توکل علی اللہ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتی ہے جہاں مومن کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے اور ساری دنیا کی مشکلیں، دشمنیاں، تکلیفیں، مضرتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

ایمان باللہ سے غیر معمولی طور سے جرأت اور بسالت اور شجاعت اور شہامت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو 2 چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان، اپنے اہل وعیال، اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض الٰہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص وہوس اور شک وحسد کے وہ رکیک جذبات بھی دور کر دیتا ہے جو اس کو جلد منفعت کیلئے ذلیل اور ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر ابھارتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کے درمیان فساد برپا کراتے ہیں۔

ایمان باللہ سے تمدن کو فائدہ پہنچتا ہے، اس سے انسانی جماعت کی افراد میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور عمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔

ان فوائد کے حصول کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے:

☆ شعوری ایمان کا حصول

رسمی اور موروثی ایمان کو شعوری ایمان میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہماری عام حالت اس وقت یہ ہے کہ ہمارے ایمان کی بنیاد کسی گہرے شعوری اور یقین پر نہیں۔ ہم بے شک اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں ، اسے علیم وحکیم، حاکم اور معبود تسلیم کرتے ہیں لیکن زیادہ تر صرف اس لئے کہ جن گودوں میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور جس ماحول میں ہماری پرورش ہوئی ہے وہاں اسے ایسا ہی مانا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایمان میں شعوری کیفیت اور بصیرت کیسے پیدا ہو سکتی ہے، اس کیلئے قرآن وسنت کا متعین کیا ہوا طریقہ موجود ہے جو مکمل اور فطری طریقہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دوسرے نا متوازن، نامکمل اور ناقص طریقوں کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

☆ لوازم صفات کا تفصیلی علم:

بیدارئ علم کے سلسلے میں دوسری ضروری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات خصوصاً اس کی صفتِ توحید کے تقاضوں سے پوری واقفیت حاصل کی جائے، اس واقفیت کے بغیر ایمان میں وہ جامعیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

☆ذکرِ دائمی:

اللہ تعالیٰ کی دائمی یاد علمی اور عقلی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور ان صفات کے لوازم کی صحیح معرفت پیدا کرنے کی مذکورہ بالا دونوں کوششیں بیداریٔ ایمان کی محض ابتدائی تدبیریں ہیں۔ اگر کوئی شخص انہی پر اپنی کوششوں کو ختم کردے تو یہ ناکافی ہے۔

☆محبتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی محبت اور پورے ذوق وشوق کے ساتھ اس کی رضا جوئی: ایمان باللہ کا صحیح معنوں میں ایمان باللہ بن جانا کیوں ناممکن ہے اور محبّ بننے کیلئے کیوں ضروری ہے، اس کے 2 اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس تعلق کی بنا پر جو اس کے اور انسان کے مابین ہے اس بات کا مستحق ہے کہ انسان کی اصلی محبت صرف اسی کیلئے ہو۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بندگی کے اس بھاری عہد کا جو انسان نے اپنے رب سے باندھ رکھا ہے، بوجھ صرف وہی اٹھا سکتا ہے جس میں محبتِ الٰہی کا جوہر موجود ہو۔

ہم اللہ تعالیٰ کے دو بابرکت نام ''الله اور الاله'' کے معانی اور مفہوم اور ان ناموں کا علم حاصل کرنے کے فوائد کے حوالے سے اپنے فہم کے مطابق روشنی ڈال رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دو بابرکت ناموں کے حوالے سے جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے، ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دیگر بابرکت ناموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسماء الحسنیٰ
اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح
عبدالستار خان

الرب

محکم تنزیل میں ارشادالٰہی ہے:

﴿ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيّاً ﴾

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں، پس تم اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟''(1)۔

علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''الرب'' اسماء الحسنٰی میں سے ایک ہے۔قرآن مجید میں مختلف صیغوں میں اس کا استعمال ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

ارشادربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴾

''کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے''(2)۔

اسی طرح سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا:

﴿ وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً ﴾

....

(1) مریم 65

(2) سباء 26

''اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہے گا کہ اے میرے رب،! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا''(3)۔

اور سورہ الناس میں ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾

''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی''(4)۔

"**الرب**" مادہ" ر ب ب "سے نکلا ہے جس کا اساسی مفہوم ''پرورش'' ہے۔اسی سے تصرف،خبر گیری اور اصلاحِ حال کا مفہوم پیدا ہوا، اسی کی بنیاد پر فوقیت، بالا دستی، سیادت اور آقائیت کے مفہوم نکلے۔

ربیب اس لڑکے کو کہتے ہیں جو کسی کے گھر میں پرورش پائے۔**رابہ** سوتیلی ماں کو اور راب سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔

سمیٹنے اور جمع کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے:

فلان یرب الناس

کا مطلب ہے کہ فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے۔

خبر گیری کرنے، اصلاحِ حال کرنے، دیکھ بھال اور کفالت کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ابوسفیان نے صفوان سے کہا تھا:

"لان یربینی رجل میں قریش احب الی من ان یربینی رجل میں ہوازن"

''قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی سرپرستی میں لے لے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ کوئی ہوازن کا آدمی ایسا کرے''۔

....

(3) الفرقان 30

(4) الناس 1

امارات اور کویت میں ''رب العمل ''کفیل کے لئے بولا جاتا ہے۔اسی مفہوم میں وہاں کفیل کیلئے ''ارباب'' کا لفظ مستعمل ہے۔

فوقیت، بالا دستی، سرداری اور حکم چلانے کے لئے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

''قد رب فلان قومه'' کا مطلب ہے کہ فلاں نے اپنی قوم کو اپنا تابع بنالیا۔

بحری جہاز کے کپتان کو ربان کہتے ہیں۔

مالک کو بھی رب کہتے ہیں۔

ابرہہ جب کعبہ ڈھانے مکہ مکرمہ آیا تھا تو اس کے آدمیوں نے عبدالمطلب کے کچھ اونٹ پر قبضہ کرلیا، عبدالمطلب ابرہہ کے پاس گیا اور اپنے اونٹ واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔اس پر ابرہہ نے کہا کہ میں تمہارا کعبہ ڈھانے آیا ہوں، تم اپنی قوم کے سردار ہو، میرا خیال تھا کہ تم مجھ سے سفارش کرنے آئے ہو کہ میں کعبہ کو نہ ڈھاؤں مگر تم تو اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنے آئے ہو جبکہ تمہیں کعبہ کی کوئی فکر نہیں؟۔

اس پر عبدالمطلب نے جواب دیا:

''اَمَّا الْاِبِل فَاَنَا رَبُّهَا وَاَمَّا الْكَعْبَةُ فَلَهَا رَبٌّ يَحْمِيْهَا ''

''اونٹ کی واپسی کا مطالبہ اس لئے کر رہا ہوں کہ میں ان کا رب (مالک) ہوں جبکہ رہا معاملہ کعبے کا تو اس کا ایک رب (مالک) ہے جو خود ہی اس کی حفاظت کرے گا''۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رب کا مطلب ہے:

1) پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت کرنے والا اور نشو ونما دینے والا۔

2) کفیل، خبر گیر، دیکھ بھال اور اصلاحِ حال کا ذمہ دار۔

3) وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس میں متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں۔

4) سید مطاع، سردار ذی اقتدار، جس کا حکم چلے، جس کی فوقیت اور بالا دستی تسلیم کی جائے۔

5)مالک،آقا۔(5)۔

قرآن مجید میں درج بالا معانی میں اس کے متعدد استعمالات ہوئے ہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿ قَالَ مَعَاذَ اللّهِ إِنَّهُ رَبِّیۡ أَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ﴾

''اس نے کہا خدا کی پناہ، وہ تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا''(6)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا:

﴿ قَالَ أَفَرَأَیۡتُم مَّا کُنتُمۡ تَعۡبُدُونَ ،أَنتُمۡ وَآبَاؤُکُمُ الۡأَقۡدَمُونَ ، فَإِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡ إِلَّا رَبَّ الۡعَالَمِیۡنَ ، الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَهُوَ یَهۡدِیۡنِ ، وَالَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ ، وَإِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ، وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ، وَالَّذِیۡ أَطۡمَعُ أَن یَغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴾

''ابراہیمؑ نے کہا: کبھی تم نے آنکھیں کھول کر ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجالاتے رہے، میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے''(7)۔

ان دونوں مقامات میں رب بمعنی اول اور دوم ''پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت کرنے والا اور نشوونما دینے والا'' استعمال کیا گیا ہے۔

....

(5) قرآن کی 4 بنیادی اصطلاحات، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مع تصرف

(6) یوسف 23

(7) الشعراء 75،82

رب بمعنی سوم ''وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس میں متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں'' سورہ ہود کی درج ذیل آیت میں ملاحظہ ہو، جب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اب تو بس تم وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو تو اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ وَلاَ يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

''اب اگر میں تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جبکہ اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کرلیا ہو، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے'' (8)۔

چوتھے معنی کو واضح کرنے کیلئے ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ ﴾

''کہو: اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بنائے'' (9)۔

درج بالا آیت میں چوتھا مفہوم ''سید مطاع، سردار ذی اقتدار، جس کا حکم چلے، جس کی فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے'' واضح ہوا ہے۔

پانچویں مفہوم ''مالک اور آقا'' کو واضح کرنے والی آیات میں سے ایک یہ ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴾

....

(8) ہود 34

(9) آل عمران 64

''اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا، پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں''(10)۔

توحید کی تین قسموں میں سے ایک قسم ''توحید ربوبیت'' ہے(11)۔ ربوبیت دو بنیادوں پر قائم ہے، ایک تخلیق میں اللہ کی توحید، دوسرا تدبیر میں اس کی توحید۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس حقیقت کو انتہائی مختصر فقروں میں واضح کر دیا۔

فرعون نے کہا:

﴿ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَى ﴾

''تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ''

﴿ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْ أَعْطَى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى ﴾

''(موسی نے) جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا''(12)۔

درج بالا آیت مبارکہ میں انتہائی مختصر جملوں میں توحید ربوبیت کی حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ رب سبحانہ وتعالی وہ ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت پر پیدا کیا اور پھر اس کی تدبیر بھی کرتا ہے۔

اس مبارک اسم میں عطا اور رجائیت ہے، یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالی نے اس نام کے ذریعہ اپنی مدح اور تعریف کی ہے۔ درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

....

(10)الانبیاء22

(11)توحید کی تین اقسام یہ ہے: توحید الوہیت، توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات۔

(12)طہ49، 50

﴿ الْحَمْدُ للّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾

''تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے''(12)۔

﴿ قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبّاً وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ﴾

''کہو: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے''(13)۔

﴿ اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾

''اللہ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرش عظیم کا رب ہے''(14)۔

﴿ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيّاً ﴾

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان اور زمین کے درمیان ہیں، پس اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟''(15)۔

﴿ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ ﴾

''(موسیٰ نے کہا) تمہارا رب بھی ہے اور تمہارے ان آباء واجداد کا رب بھی ہے جو گزر چکے ہیں''(16)۔

انبیاء اور صالحین کی جو دعائیں قرآن مجید میں نقل ہوئی ہیں ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اسی نام سے دعا کی ہے:

حضرت آدم اور حوا علیہا السلام کی دعا دیکھئے:

....

(12) الفاتحہ 2

(13) الانعام 164

(14) النمل 26

(15) مریم 65

(16) الشعراء 26

﴿ قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾

''وہ دونوں بول اٹھے: اے ہمارے رب، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے'' (17)۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾

''میرے رب، مجھے اور میرے والدین کو اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے'' (18)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی مبارک نام کے ذریعہ دعا کرتے ہیں:

﴿ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأَخِيْ وَأَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ﴾

''اے میرے رب، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے'' (19)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ملاحظہ کیجیے:

﴿ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِن تَأْوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّيْ فِيْ الدُّنُيَا وَالآخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِماً وَأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ ﴾

''اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا، زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار

....

(17) الاعراف 23

(18) نوح 28

(19) الاعراف 151

مجھے صالحین کے ساتھ ملا“ (20)۔

سرکار دو جہاں، نبی اکرم ﷺ کی بہت سی دعائیں منقول ہیں، آپ ﷺ نے بھی اکثر و بیشتر اسی مبارک اسم کے ذریعہ دعائیں فرمائی ہیں، بطور نمونہ صرف ایک دعا نقل کی جارہی ہے:

”اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ، لاَ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ......“

”اے اللہ تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں“۔

ائمہ لغت نے رب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

”ھُوَ الَّذِیْ اَنْشَاءَ الشَّئ حَالاً فَحَالاً اِلیٰ حَدِّ التَّمَامِ“

”رب وہ ہے جو کسی چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر اس کو پایہ کمال تک پہنچاتا ہے“۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

”اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جود ہوگا اور احسان ہوگا لیکن وہ بات نہیں ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کیلئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل سامان ہوتا رہے نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت وشفقت کے ساتھ ہو کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا“ (21)۔

مجازی ربوبیت کی مثال ماں کی مامتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی بھی قوتیں سب کی سب پرورش کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت وشفقت، حفاظت ونگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک بچہ اپنے جسم وذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔

....

(20) یوسف 101

(21) تفسیر ترجمان القرآن، ازمولانا ابوالکلام آزادؒ، ص 35

''چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو'' (22)۔

''پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آ جائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح سے پالے اور پوسے جا رہے ہیں'' (23)۔

''دنیا کی کونسی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں۔ جس بچے کی پیدائش اس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی، اس کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ سن بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا وہ اپنے لئے نہیں بلکہ بچے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ لیکن دیکھو، کارساز فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آ جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے، اس لئے یہ کہ نظام ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا متقاضی یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچے کی پرورش ہو، اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبہ محبت میں رکھ دیا تھا، جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی، اب اس کا باقی

....

(22) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد، ص 36

(23) ایضاً، ص 40

رہنا ماں کیلئے بوجھ اور بچے کے لئے رکاوٹ ہوتا ہے'' (24)۔

ارشاد ربانی ملاحظہ کیجئے:

فرعون نے کہا:

﴿ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَى ﴾

''تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ''

﴿ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى ﴾

''(موسی نے) جواب دیا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا'' (25)۔

''ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کا محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا کا سر چشمہ کہاں ہے؟'' (26)۔

جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف ہمارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے:

....

(24) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزادؒ

(25) طہٰ 49، 50

(26) تفسیر ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد، ص 44

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

''لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہوسکتی ہے'' (27)۔

جس رب العالمین نے ہماری پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کررکھا ہے کیا ممکن ہے کہ اس نے ہماری روحانی فلاح وسعادت کے لئے کوئی قانون، کوئی قاعدہ اور کوئی نظام مقرر نہ کیا ہو، جس طرح ہمارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح ہماری روح کی بھی ضرورتیں ہیں، کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشوونما کیلئے تو اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن روح کی نشوونما کے لئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اسی طرح ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کیا گیا۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جائے اتنی ہی قیمتی اور بامقصد بھی ہوتی ہے۔ انسان کرہ ارضی کی بہترین مخلوق اور سلسلہ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی ومعنوی نشوونما کے لئے فطرت کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چندروزہ زندگی کیلئے ہی بنایا گیا ہو:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لا تُرْجَعُونَ ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴾

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں؟ پس بالا وبرتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی کوئی خدا اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا'' (28)۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ رب کا لفظ استعمال کرکے اس کی عبادت کی دعوت دی گئی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ...... ﴾

....

(27) البقرہ 21، واضح رہے کہ یہ ترجمہ تفہیم القرآن، از مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ سے لیا گیا ہے۔

(28) المومنون 115، 116

''لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا خالق ہے'' (29)۔

ہمارا رب جو اتنا شفیق اور مہربان ہے، کیا وہ ہمیں سزا بھی دیگا؟۔اس حوالے سے ایک لطیف روایت ملاحظہ کریں:

راوی کہتے ہیں:

''ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے ہوئے تھے کہ ہمارا گزر کچھ لوگوں سے ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا ''تم کون ہو'' انہوں نے جواب دیا ''ہم مسلمان ہیں'' ان میں سے ایک عورت تھی جو لکڑیاں جلائے کچھ پکا رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کا شیر خوار بیٹا بھی تھا۔وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیا، پھر اس نے کہا:

''میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان، کیا اللہ تعالی ارحم الراحمین نہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں''۔

عورت نے کہا:

''کیا اللہ تعالی اپنے بندوں پر ماں سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں''

عورت نے کہا:

''مگر ماں تو اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالتی''۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

....

(29) البقرہ 21

''اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں میں سے صرف سرکشوں اور باغیوں کو ہی آگ میں ڈالتا ہے'' (30)۔

اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھئے:

﴿ مَّا يَفْعَلُ اللّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ وَكَانَ اللّهُ شَاكِراً عَلِيماً ﴾

''آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے، اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو، اللہ بڑا قدر دان اور سب کے حال سے واقف ہے'' (31)۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''شکر کے اصل معنی اعتراف نعمت یا احسان مندی کے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خوا مخواہ تمہیں سزا دے۔ صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے، انہی تینوں چیزوں کا نام شکر ہے'' (32)۔

قارئین کرام!

اب تک جو بحث کی گئی وہ رب بمعنی اول، دوم اور سوم کی گئی تھی، اب ربوبیت بمعنی چہارم اور پنجم پر بحث کرتے ہیں۔

ان دونوں معانی کو واضح کرنے کیلئے ہمیں فرعون اور نمرود کی مثال دینی ہوگی جنہوں نے ربوبیت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ یہ بات ہمارے ذہن نشین ہونی چاہئے کہ فرعون اور نمرود بھی اللہ کو رب مانتے تھے۔ ان

....

(30) مشکوۃ 2316 اور العلل 3/185، بعض محدثین نے اسے ضعیف اور بعض نے بے اصل کہا ہے۔

(31) النساء 147

(32) تفہیم القرآن 1/412

کے نزدیک پالنے والا، پرورش کرنے والا، کفیل، خبر گیر اور اصلاح حال کا ذمہ دار اللہ ہی تھا اور اس معنی میں وہ اسے رب بھی مانتے تھے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ أَلَمُ تَرَ إِلَى الَّذِىُ حَآجَّ إِبُرَاهِيُمَ فِىُ رِبِّهِ أَنُ آتَاهُ اللّهُ الُمُلُکَ ﴾

''کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا، جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اور اس کی بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی''۔

﴿ إِذُ قَالَ إِبُرَاهِيُمُ رَبِّىَ الَّذِىُ يُحۡيِىُ وَيُمِيُتُ قَالَ أَنَا أُحۡيِىُ وَأُمِيُتُ ﴾

''جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے''۔

﴿ قَالَ إِبُرَاهِيُمُ فَإِنَّ اللّهَ يَأۡتِىُ بِالشَّمُسِ مِنَ الُمَشُرِقِ فَأۡتِ بِهَا مِنَ الُمَغُرِبِ ﴾

''ابراہیم نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا''

﴿ فَبُهِتَ الَّذِىُ كَفَرَ ﴾

''یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا'' (33)۔

نمرود ایسی احمقانہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے۔ اس کا دعوی یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں یا رب السماوات والارض ہوں بلکہ اس کا دعوی صرف یہ تھا کہ میں اس مملکت کا رب ہوں چنانچہ میرا کہا مانا جائے، میرے قانون کی پیروی کی جائے، میری اطاعت کی جائے اور میری فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے۔

فرعون کا حال بھی کم وبیش نمرود کی طرح ہے کہ وہ اللہ کے وجود سے منکر نہ تھا بلکہ وہ صرف خو کو رب بمعنی چہارم اور پنجم قرار دیتا تھا۔ فرعون کے حوالے سے یہ معنی اس وقت واضح ہوتے ہیں جب ایک

....

(33) البقرہ 258

مومن بندہ فرعون کے دربار میں کہتا ہے:

﴿ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلاً أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ وَإِن يَكُ كَاذِباً فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن يَكُ صَادِقاً يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾

''اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اٹھا: کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا، اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے، اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو''۔

﴿ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِن بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءنَا ﴾

''میری قوم کے لوگو آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین پر تم غالب ہو لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے''۔

آل فرعون کا مرد مومن مزید کہتا ہے:

﴿ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ، يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴾

''اے قوم! مجھے ڈر ہے کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا''۔

﴿ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ، يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا

مَتاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ، مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾

''وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا: اے میری قوم کے لوگو، میری بات مانو، میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں، اے قوم، یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، ہمیشہ قیام کی جگہ آخرت ہی ہے، جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہوگی، اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا''(34)۔

مذکورہ بالا آیات دراصل وہ خطبہ ہے جو اس مردمومن نے فرعون کے سامنے دیا تھا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون بھی جانتا تھا کہ خالق و مالک دراصل اللہ تعالی ہی ہے،اس نے خود کو رب اس بنا پر قرار دیا تھا کہ وہ مصر کا مالک ہے چنانچہ اس کا کہا مانا جائے، اس کی اطاعت کی جائے، اس کی فوقیت اور بالادستی تسلیم کی جائے۔

اسی طرح قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کے اقوام اللہ کو پرورش کرنے والا، کفیل، خبر گیر اور اصلاح حال کا ذمہ دار مانتے تھے۔

قوم نوح کی مثال ہمارے سامنے ہے:

﴿ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاء اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴾

''اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے: یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے، اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا، یہ بات تو

....

(34) مومن 28 تا 40

کبھی اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)''(35)۔

کیا یہ خطاب ان لوگوں سے ہوسکتا ہے جو سرے سے اللہ کے وجود کے منکر ہوں؟۔حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا:

﴿ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً ﴾

''میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے''(36)۔

قوم اللہ کے وجود کی منکر نہ تھی تبھی تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ اپنے رب سے معافی مانگو، ہاں قوم اس بات پر مصر تھی کہ اللہ رب العالمین ہے مگر دوسرے بھی خدائی انتظام میں دخل رکھتے ہیں:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدّاً وَلَا سُوَاعاً وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْراً ﴾

''ان کے سرداروں اور پیشواؤں نے کہا: لوگو! اپنے الہوں کو نہ چھوڑو، ودا اور سواع اور یغوث ویعوق اور نسر کو نہ چھوڑو''(37)۔

یہی مثال قوم عاد کی بھی ہے:

﴿ قَالُواْ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴾

''انہوں نے جواب دیا: کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہم بس اکیلے اللہ ہی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے''(38)۔

....

(35)المومنون 24

(36)نوح 10

(37)نوح 23

(38)الاعراف 70

یہی تصور قوم ثمود میں بھی ملتا ہے:

﴿ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ، إِذْ جَاءتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاء رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴾

''(اے محمد ﷺ) اگر یہ لوگ تمہاری پیروی سے منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ عاد اور ثمود کو جو سزا ملی تھی ویسی ہی ایک ہولناک سزا سے میں تمہیں ڈراتا ہوں، جب ان قوموں کے پاس ان کے پیغمبر آگے اور پیچھے سے آئے اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا کہ ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا تم جو کچھ لے کر آئے ہو اسے ہم نہیں مانتے'' (39)۔

﴿ قَالُواْ يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوّاً قَبْلَ هَـذَا أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴾

''انہوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری بڑی امیدیں تم سے تھیں، کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے، تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے'' (40)۔

اسی سے ملتا جلتا تصور قوم لوط علیہ السلام کا بھی ہے، قوم کا جرم انکار الوہیت و ربوبیت نہ تھا بلکہ اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور قانون کی پیروی سے انکاری تھے:

﴿ وَلُوطاً إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ، أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ

....

(39) حم سجدہ 13، 14

(40) ہود 62

قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴾

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا تم لوگ وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو، تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو'' (41)۔

رب کے بارے میں قوم شعیب کے تصورات دیکھئے، قوم شعیب کو تو ان کے رسول نے خطاب کرتے ہوئے ''اگر تم مومن ہو'' کہا:

﴿ وَيَا قَوْمِ أَوْفُواْ الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْيَاء هُمْ وَلاَ تَعْثَوْاْ فِي الأَرْضِ مُفْسِدِينَ ، بَقِيَّةُ اللّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَمَا أَنَاْ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ، قَالُواْ يَا شُعَيْبُ أَصَلاَتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاء ﴾

''اے برادران قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپو اور تولو، لوگوں کو ان چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو، اللہ کی عنایت سے کاروبار میں بچت ہو وہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تمہارے اوپر کوئی نگہبان نہیں، انہوں نے جواب دیا: کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کردیں'' (42)۔

یہود ونصاری کو تو قرآن ''اہل الکتاب'' کہتا ہے، ان کا جرم یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اللہ کو اپنا رب ماننے سے انکاری ہوں۔ان کی گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے بزرگ ہستیوں کو خدائی کے مرتبے پر پہنچادیا

....

(41) العنکبوت 28، 29

(42) ہود 85، 87

اوران کی پرستش کرنے لگے:

﴿ اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ ﴾

''انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو بھی اپنا رب بنالیا'' (43)۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دراصل نجران کے نصاریٰ پر اتری تھی۔ اس پر حضرت عدیؓ بن حاتم نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا:

''نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو کبھی اپنا رب نہیں بنایا''۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء اور مشائخ جس چیز کو حلال قرار دیتے تھے، تم اسے حلال سمجھتے اور چیز کو حرام قرار دیتے تھے تم اسے حرام سمجھتے''۔

حضرت عدیؓ نے کہا: ہاں! ایسا تو ہوتا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہی ان کی عبادت ہے'' (44)۔

اس سے جو چیز کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس کی اطاعت کی جاتی ہے گویا اس کی عبادت کی جارہی ہے اور اسے رب بنایا جاتا ہے۔

مشرکین عرب خود کو دین ابراہیم علیہ السلام کے پیرو کہا کرتے تھے۔ کیا انہیں حق جل شانہ کی الوہیت اور ربوبیت سے انکار تھا؟ کیا انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے انکار تھا یا وہ اللہ کو دعائیں سننے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا نہیں سمجھتے تھے؟۔ کیا ان کا خیال تھا کہ لات ومنات، عزیٰ اور ہبل نے

....

(43) التوبہ 31

(44) حقیقة الاسلام و الایمان، از علامہ ابن تیمیہؒ

کائنات کوتخلیق کیا اور وہی مدبر اور منتظم ہیں۔اس کا جواب قرآن ہمیں دیتا ہے:

﴿ قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ، قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ، قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ، سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ ، بَلْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴾

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہو، زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملک ہے؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی ملک ہے، کہو پھر تم نصیحت قبول کیوں نہیں کرتے، کہو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ، کہو پھر تم نہیں ڈرتے، کہو ہر چیز کے شاہانہ اختیارات کس کے ہاتھ میں ہیں، اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلے میں پناہ دینے کی طاقت کسی میں نہیں، بتاؤ اگر جانتے ہو، وہ کہیں گے یہ صفت اللہ ہی کی ہے، کہو پھر کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے؟'' (45)۔

اگر مکہ کے مشرکین اللہ تعالی کو مالک کائنات، عرش عظیم کا رب، تمام اختیارات کا مالک اور پناہ دینے والا مانتے تھے تو پھر اسلام سے ان کا جھگڑا کس بات پر تھا؟ کیا وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے لات، منات اور ہبل کی پرستش کی، قرآن مجید ہمیں اس کا جواب دیتا ہے:

﴿ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ﴾

''خبردار! دین خالص اللہ کا حق ہے، رہے وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں

....

(45) المومنون 84، 90

کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں'' (46)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا:

﴿ وَيَقُولُونَ هَـؤُلاء شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّهِ ﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور ہماری سفارشی ہیں'' (47)۔

درج بالا تفصیل سے گمراہ قوموں کے نظریات قرآن کریم سے واضح ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی بھی قوم خدا کی ہستی کی منکر نہ تھی البتہ انہوں نے رب کے پانچ مفہوموں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا:

1) رب کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبر گیری، حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے، ان کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ رب اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے مگر اس کے ساتھ فرشتوں، دیوتاؤں، جنوں، غیر مرئی قوتوں، ستاروں، سیاروں، انبیاء اور روحانی پیشوا کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

2) رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدار اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے، ان کے نزدیک ایک دوسری حیثیت رکھتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے انسانوں کو رب مانتے یا نظریہ کی حد تک اللہ کو رب ماننے کے بعد عملاً انسانوں کی اخلاقی، تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سر اطاعت خم کئے دیتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے ابتداء سے انبیاء آتے رہے۔ ان کی دعوت تھی کہ ربوبیت ناقابل تقسیم ہے۔ قرآن مجید ربوبیت کو حاکمیت اور سلطانی کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ رب یہ تصور پیش کرتا ہے کہ وہ کائنات کا سلطان مطلق اور لاشریک مالک و حاکم ہے۔

....

(46) الزمر 3

(47) یونس 18

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور تمام جہان کا پروردگار، مربی اور حاجت روا ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا کفیل، خبر گیر، مختار اور معتمد علیہ ہے۔

اسی حیثیت سے اس کی وفاداری وہ قدرتی بنیاد ہے جس پر ہماری اجتماعی زندگی کی عمارت صحیح طور پر قائم ہوسکتی ہے۔اس کی مرکزیت سے وابستگی تمام متفرق افراد اور گروہوں کے درمیان ایک امت کا رشتہ پیدا کردیتی ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہماری اور تمام مخلوقات کی بندگی، اطاعت اور پرستش کا مستحق ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور ہر چیز کا مالک، آقا اور فرمانروا ہے۔

رب کے بارے میں درج بالا تصور ہمارے ذہن میں واضح ہونا چاہئے۔رب کیونکہ ہمارا مالک ہے اس لئے اسی کا حکم چلنا چاہئے، اسی کی فرمانبرداری اور اطاعت کی جائے اور اسی کا نظام اور قانون نافذ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد جو اولین حکم ملا وہ قابل غور ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِر، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو'' (48)۔

رب کے متعلق قرآن مجید کا جو تصور درج بالا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ آیت کو دوبارہ پڑھیں، رب کی بڑائی کا اعلان بجز اس کے اور کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہو اور اسی کا قانون اور نظام نافذ کیا جائے۔

جب اس معنی میں آدمی اللہ تعالی کو اپنا رب کہے گا تو پھر دنیا اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گی۔اس کی راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے، اسے تکلیف اور مصیبتوں سے گزارا جائے گا اور اس کے اپنے بھی دشمن ہوجائیں گے۔اللہ تعالی کو اپنا رب کہنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، اس کی

....

(48)المدثر 1،3

تفصیل قرآن مجید میں ہمیں جگہ جگہ ملتی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوا ﴾

''جن لوگوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے، پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے''۔

ربنا اللہ کہنے کے بعد اپنے کہے پر جوڈٹ جاتے ہیں، جم جاتے ہیں، ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے:

﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحۡزَنُوا وَأَبۡشِرُوا بِالۡجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمۡ تُوعَدُونَ ، نَحۡنُ أَوۡلِيَاؤُكُمۡ فِي الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا وَفِي الۡآخِرَةِ وَلَكُمۡ فِيهَا مَا تَشۡتَهِيٓ أَنفُسُكُمۡ وَلَكُمۡ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ، نُزُلاً مِّنۡ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴾

''یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، نہ ڈرو نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں تم جو کچھ چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے''(49)۔

ربنا اللہ کہنے کے بعد اس پر استقامت دکھانے والوں کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

اللہ تعالی ان جادوگروں کی مثال دیتا ہے جو حضرت موسی علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے، مقابلہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے فرعون سے کہا:

﴿ وَجَاء السَّحَرَةُ فِرۡعَوۡنَ قَالُواۡ إِنَّ لَنَا لأَجۡراً إِن كُنَّا نَحۡنُ الۡغَالِبِينَ ﴾

''جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟''۔

فرعون نے جواب میں کہا:

﴿ قَالَ نَعَمۡ وَإَنَّكُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِينَ ﴾

....

(49)حم سجدہ 30،32

’’اس نے کہا: ہاں، اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے‘‘(50)۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ یہ جادوگر محض دنیاوی انعام کے لالچ میں آئے تھے اور فرعون نے بھی انہیں انعام واکرام کے علاوہ اپنے مقربین میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب مقابلہ شروع ہوا تو قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

﴿ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴾

’’اور بڑا ہی زبردست جادو لائے‘‘(51)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں وہ انتہائی عظیم جادو لائے تھے مگر حق کو دیکھنے کے بعد ان کا کیا حال ہوا:

﴿ وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴾

’’اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا‘‘(52)۔

اللہ نے ان کیلئے ایسا بندوبست کر دیا کہ وہ جادوگر مجبور ہو گئے سجدہ کرنے کیلئے۔ انہوں نے سجدہ کیا اور فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اعلان کیا:

﴿ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ، رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ ﴾

’’ہم نے رب العالمین کو مان لیا، اس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں‘‘(53)۔

وہ جادوگر جو دنیاوی لالچ کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے آئے تھے، بھرے دربار میں اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے کا اقرار کرتے ہیں اور چونکہ فرعون بھی اپنے آپ کو رب کہتا تھا لہٰذا جادوگروں

....

(50)الاعراف113، 114

(51)الاعراف116

(52)الاعراف120

(53)الاعراف121، 122

نے وضاحت ضروری سمجھی کہ ہم اس رب العالمین کو مانتے ہیں جو موسی اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔

مگر کیا فرعون اپنی اس توہین پر خاموش رہ سکتا تھا؟۔ یقیناً نہیں! ہار اور جیت کا فیصلہ تو اسی کو کرنا تھا، اس نے بلکتے ہوئے کہا:

﴿ إِنَّ هَـذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُواْ مِنْهَا أَهْلَهَا ﴾

''یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کردو'' (54)۔

تم نے بڑی چال چلی اور لگتا ایسا ہے کہ (حضرت) موسی (علیہ السلام) تمہارا استاد ہے:

﴿ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾

''معلوم ہوگیا کہ یہ تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی'' (55)۔

وہ فرعون جس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کروادیا اور جو کہا کرتا تھا:

﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ﴾

''میں تمہارا رب اعلی ہوں'' (56)۔

جادوگروں کو دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

﴿ لأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلاَفٍ ثُمَّ لأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴾

''میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوادوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا'' (57)۔

جادوگروں کو یقین تھا کہ فرعون جب اس طرح کی دھمکی دیتا ہے تو وہ محض دھمکی ہی نہیں ہوتی، وہ

....

(54) الاعراف 123

(55) طہ 71

(56) النازعات 24

(57) الاعراف 124

یقیناً ایسا ہی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کو محض زبان سے اپنا رب کہنا کمال نہیں بلکہ اس پر ڈٹ جانا ہی اصل مقصود ہے، اس موقع پر جو لوگ ڈٹ جاتے ہیں ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور وہ ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، ہم تمہارے ساتھی ہیں، چنانچہ جادوگروں نے ایسا ہی کیا:

﴿ قَالُوا لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴾

''جادوگروں نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں، تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے، تو زیادہ سے زیادہ اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے''(58)۔

اللہ کو اپنا رب کہنے اور اس پر استقامت دکھانے والوں کیلئے قیامت تک کیلئے یہ مثال ہے۔ ایمان لانے سے پہلے جادوگروں نے فرعون کی عزت کا نعرہ لگایا تھا:

﴿ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴾

''فرعون کی عزت کی قسم، آج ہم ہی غالب رہیں گے''(59)۔

مگر اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہنے کے بعد فرعون سے کہنے لگے:

﴿ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ﴾

''ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کردے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے، اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے''(60)۔

....

(58)طہ 72

(59)الشعراء 44

(60)طہ 73

ان جادوگروں کے ساتھ فرعون نے کیا معاملہ کیا؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا، تفاسیر میں ہے کہ فرعون نے ان جادوگروں کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں میں کٹوا دیئے، انہیں دردناک عذاب دے کر انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ اللہ تعالی ان مومن جادوگروںؒ کو جنت الفردوس نصیب کرے مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں کیوں نہیں ہے؟۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ بعد کے واقعات کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کے ذکر کی اہمیت نہیں۔ گویا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اللہ کو اپنا رب ماننے والوں کے ساتھ طاغوت ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہا ہے۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کی ایک اور مثال اس مردِ مومن کی ہے جس کا ذکر سورہ یاسین میں کیا گیا:

﴿ وَجَاء مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى ﴾

''اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا''۔

اس مرد نے آ کر اپنی قوم سے کہا:

﴿ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ﴾

''اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی اختیار کرو''۔

جب میں تم سے کہتا ہوں کہ ان کی پیروی کرو تو اس لئے کرو کہ:

﴿ اتَّبِعُوا مَن لاَّ يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴾

''پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں''۔

انہوں نے کھل کر اس بات کا اعلان کیا کہ:

﴿ إِنِّي آمَنتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونِ ﴾

''میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو''۔

شہر کے دور دراز گوشے سے دوڑتے ہوئے آنے والا اس مردِ مومن کا نام حبیب النجارؒ بتایا جاتا ہے۔

قرآن مجید ہمیں یہ تفصیل نہیں بتا تا کہ جب حضرت حبیب النجارؓ نے پوری قوم کو یہ کہہ کر چیلنج کیا کہ میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟۔قرآن مجید جو منظر ہمیں دکھاتا ہے، وہ ان کی شہادت کے بعد کا ہے:

﴿ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ﴾

''اس سے کہا گیا: داخل ہو جاؤ جنت میں'' (61)۔

مگر تفاسیر میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت حبیب النجارؓ نے جب قوم سے کہا کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں تو انہیں آروں سے چیرا گیا۔ دوسری روایت ہے کہ انہیں کچلا گیا یہاں تک کہ ان کی آنتیں باہر آ گئیں ۔قرآن نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ گویا اللہ کو اپنا رب کہنے اور اس پر استقامت اختیار کرنے والوں کو دنیا کبھی برداشت نہیں کرتی ،ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کی ایک اور مثال ان نوجوانوں کی ہے جنہوں نے اپنا دین اور ایمان بچانے کیلئے غار میں پناہ لی تھی اور اللہ تعالی نے انہیں 309 سال تک سلا دیا تھا،قرآن مجید ان کی تفصیل ہمیں بتاتا ہے:

﴿ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ﴾

''وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی''۔

جب انہوں نے صدق نیت دکھائی اور ان کے اخلاص میں کھوٹ نہیں تھا تو اللہ تعالی نے بھی ان کے ایمان کو مضبوط کر دیا:

﴿ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ ﴾

''ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے''۔

اللہ کو اپنا رب کہنے کے بعد وہ کسی گوشہ میں چھپ کر نہیں بیٹھے بلکہ:

....

(61) یاسین 13 تا 28

﴿ إِذْ قَامُوا ﴾

''جب وہ اٹھے اور کھڑے ہو گئے''۔

وہ ڈٹ گئے اور پوری قوم سے ٹکر لیتے ہوئے کہا:

﴿ فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَهاً ﴾

''ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے''۔

اللہ تعالی نے اپنے ان نوجوان بندوں کی حفاظت یوں فرمائی کہ ایک غار میں انہیں 309 سال تک سلا دیا اور ان کا ذکر قیامت تک کیلئے زندہ کر دیا(62)۔

اس طرح ربنا اللہ کہنے والوں کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں، اسی لئے ہم سے مطالبہ ہے کہ:

﴿ كُونُواْ رَبَّانِيِّينَ ﴾

''تم ربانی بن جاؤ''(63)۔

اللہ تعالی کے مبارک نام رب کی مذکورہ تفصیل اور معانی سامنے رکھئے، پھر سوچئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہر شخص سے قبر میں پہلا سوال جو ہوگا وہ یہ ہوگا:

''مَنْ رَبُّکَ''

''تمہارا رب کون ہے؟''۔

یعنی بتاؤ تم نے دنیا میں کس کس کو رب بنا رکھا تھا؟۔

اللہ تعالی کے مبارک نام ''الرب'' کے حوالے سے پوری تفصیل گزر چکی ہے۔اس سے ہمیں معلوم

....

(62) درج بالا آیات اور مذکورہ واقعہ سورہ الکہف 10 تا 22 میں مذکور ہے۔

(63) آل عمران 79

ہوا کہ ربوبیت نا قابل تقسیم ہے۔ جب اللہ تعالی ہمارا رب ہے یعنی پالنے والا، پرورش کرنے، خبر گیری کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا تو اسی کا اقتدار اور اسی کا حکم چلنا چاہئے۔اسی کا قانون نافذ ہو۔ ہم اللہ سبحانہ وتعالی کو اپنا رب مانیں اور تسلیم کریں۔ ہمارے دلوں میں جتنے بھی ارباب ہیں ان سب کو نکال باہر کریں اور اسی رب کی بالا دستی تسلیم کریں جو حقیقی معنوں میں ہمارا رب ہے۔

اللہ تعالی ہمیں توفیق عطا کرے۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں ویڈیو ڈی وی ڈی، سی ڈی اور آڈیو کیسٹ میں بھی دستیاب ہے۔

اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی عصری اور آسان تشریح

عبدالستار خان

الرحمن الرحیم

سورہ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ، الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ، مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴾

”اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے، تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمٰن اور حیم ہے، روز جزا کا مالک ہے“۔

”اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد رحیم کے اضافے میں مبالغے کا نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے اور ایسی بے حد وحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑے مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے کہ اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کیلئے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ”سخی“ کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ”داتا“ کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ”گورے“ کو کافی نہیں سمجھتے تو اس پر ”چٹے“ کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں“ (1)۔

”الرحمٰن خاص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو محض اس نام سے پکارے

....

(1) تفہیم القرآن، از سید الاابوالاعلی مودودیؒ، 1/44

یا پکارا جانا پسند کرے۔علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالی دنیا میں عموماً رحمت کے اعتبار سے رحمٰن ہے اور یہ رحمت مومن اور کافر دونوں کیلئے عام ہے لیکن آخرت میں خاص طور پر اپنے فرمانبردار بندوں پر رحمت کے اعتبار سے رحیم ہے۔رحمت کے لفظ کے معنی تو معلوم ہیں لیکن کیفیت کے ادراک سے مخلوق عاجز ہے'' (2)۔

عربی میں ''فعلان'' کا باب عموماً ایسے صفات کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں، مثال کے طور پر:

پیاسے کیلئے: عطشان

غضبناک کیلئے: غضبان

سراسیمہ کیلئے: حیران

مست کیلئے : سکران

لیکن ''فعیل'' کے وزن میں صفات قائمہ کا خاصہ ہے۔یعنی عموماً ایسی صفات کیلئے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں، مثلاً:

کریم: کرم کرنے والا

عظیم: بڑائی کرنے والا

علیم: علم رکھنے والا

حکیم: حکمت رکھنے والا

پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر آن اور ہر لمحہ تمام کائناتِ خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

....

(2) الاسماء الحسنی، از محمد ایوب سپرا، ص 47

''رحمت کو دو الگ الگ ناموں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس لئے کہ قرآن خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ تمام تر رحمت ہی ہے''(3)۔

الرحمٰن الرحیم، دو عظیم الشان اسم ہیں جن سے اللہ تعالی نے ام القرآن یعنی سورہ الفاتحہ کا آغاز کیا نیز قرآن مجید کی ہر سورہ کا افتتاح بھی اسی سے کیا۔ یہ وہ دو نام ہیں جن سے انسان شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے، یہی وہ نام ہیں جن سے حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کے نام اپنے خط کا افتتاح کیا:

﴿ إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴾

''(ملکہ بولی:) اے اہل دربار! میری طرف ایک اہم خط پھینکا گیا ہے، وہ سلیمان کی جانب سے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے''(4)۔

اور انہی دو ناموں کو لے کر حضرت جبریل علیہ السلام ہر نئی سورہ کا افتتاح کرتے تھے''(5)۔

علامہ خطابیؒ کا کہنا ہے:

''الرحمٰن وہ ہے جس کی رحمت تمام مخلوق پر چھا گئی ہے۔ ان کا رزق، ان کا معاش اور ان کے تمام اسباب اسی میں داخل ہیں۔ اس کے رحمت کے تحت کافر اور مومن، صالح اور فاجر سب شامل ہیں جبکہ الرحیم صرف مومنوں کے لئے خاص ہے''(6)۔

الرحمٰن اللہ تعالی کی ذاتی صفت ہے جبکہ الرحیم کا تعلق مرحوم سے ہے، یعنی وہ جس پر رحم کیا گیا۔ اس

....

(3) ترجمان القرآن، از مولانا ابوالکلام آزاد 1/64

(4) النمل 30

(5) فقه الاسماء الحسنى ، عبد الرزاق بن عبد المحسن البدر ، ص99

(6) الجامع لاسماء الله الحسنى، حامد احمد اطاهر، ص140

طرح پہلا نام وصف ہے جبکہ دوسرا فعل۔ پہلے نام سے مراد یہ ہے کہ رحمت اس کی صفت ہے جبکہ دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر رحم کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيماً ﴾

''وہ مومنوں پر بہت رحیم ہے'' (7)۔

﴿ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾

''بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا ہے'' (8)۔

قرآن مجید میں کہیں بھی " رحمن بهم " یعنی وہ ان پر رحمٰن ہے، نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ رحمٰن وہ ہے جس کی صفت رحمت ہے اور رحیم وہ ہے جو اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے'' (9)۔

قرآن مجید میں الرحمٰن کا ذکر 57 مرتبہ ہوا جبکہ الرحیم 123 مرتبہ آیا ہے۔ اکثر مواقع میں الرحیم ''التواب، الغفور، الروؤف، الودوداور العزیز'' کے ساتھ وارد ہوا ہے (10)۔

اللہ تعالی اپنے عرش پر رحمٰن کے نام سے جلوہ افروز ہوا:

﴿ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ﴾

''وہ رحمٰن، تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے'' (11)۔

﴿ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمَنُ ﴾

''پھر آپ ہی عرش پر جلوہ فرما ہوا، رحمٰن'' (12)۔

....

(7) الاحزاب 43

(8) التوبہ 117

(9) بدائع الفوائد، از علامہ ابن قیمؒ، ص 20، 21

(10) دیکھئے قرآن سرچ انجن: المصحف الرقمی

(11) طٰہٰ 5 (12) الفرقان 59

کیونکہ عرش الٰہی ساری کائنات پر محیط اور اس کو گھیرے ہوئے ہے اور رحمٰن کی رحمت تمام مخلوقات پر سایہ فگن ہے:

﴿ وَرَحْمَتِى وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ﴾

''میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے'' (13)۔

اس ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک دعا نقل کی جاتی ہے، آپؒ دعا کیا کرتے تھے:

''اے اللہ تو نے کہا ہے اور تیرا کہا سچ ہے، میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، میں بھی ایک چیز ہوں، مجھ پر بھی تیری رحمت چھا جائے''۔

اللہ کی رحمت کے دو حصے ہیں:

ایک عام رحمت جو تمام مخلوقات کیلئے یکساں ہے۔ اسی رحمت میں ان کی تخلیق، تدبیر، رزق، نعمتیں اور احسانات وغیرہ داخل ہیں۔

علامہ ابن عثیمینؒ کا کہنا ہے:

''کافر کے لئے اس کی رحمت بدنی اور دنیوی ہے، دنیا میں کافر کو رزق اور نعمتیں اللہ ہی عطا کرتا ہے اور ان نعمتوں کا تعلق صرف دنیا تک ہے'' (14)۔

رحمت کا دوسرا حصہ صرف مومنین کے لئے ہے، وہی ان کے دنیاوی معاملات کی تدبیر کرتا ہے، وہی ان کو ہدایت عطا کرتا ہے، وہی انہیں صراط مستقیم پر چلاتا ہے، وہی ان کے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان کے درجات کو بلند کرتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ هُوَ الَّذِى يُصَلِّى عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ

....

(13) الاعراف 156

(14) شرح العقیده الواسطیه 1/249

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْماً ﴾

''وہی ہے جوتم پر رحمت فرماتا ہےاوراس کے ملائکہ تمہارے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے''(15)۔

علامہ ابن قیمؒ کا کہنا ہے:

اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، اس کی نعمت ہر مخلوق تک پہنچی ہوئی ہے، اس رحمت کی وہاں تک پہنچ ہے جہاں تک اس کا علم پہنچا ہوا ہے۔

علامہ ابن القیمؒ مزید فرماتے ہیں:

اللہ کی رحمانیت سورہ الرحمٰن میں کھل کر سامنے آتی ہے، ارشاد ہوا:

﴿ الرَّحْمَنُ ، عَلَّمَ الْقُرْآنَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴾

''الرحمٰن، اس نے قرآن کو تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اسے بولنا سکھایا''(16)۔

سورہ الرحمٰن کی ابتدا رحمٰن کی رحمانیت کے چار اہم مظاہر سے ہوئی:

* اللہ تعالی کے تمام مبارک ناموں میں سے عظیم المرتبت نام الرحمٰن کا ذکر ہوا۔
* اللہ تعالی کی تمام کتابوں میں قرآن مجید کو الرحمٰن نے تعلیم دی۔
* تمام مخلوقات میں سب سے افضل، انسان کی تخلیق کا ذکر ہوا۔
* انسان میں سب سے نمایاں اور افضل ترین صفت، بیان کا ذکر ہوا۔

سورہ الرحمٰن کا اختتام اس بات پر ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴾

....

(15) الاحزاب 43

(16) الرحمٰن 1، 4

''بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام'' (17)۔

برکت والا نام وہ ہے جس سے اس سورہ کی ابتداء ہوئی، یعنی الرحمٰن، اسی بابرکت نام سے ہی برکت کا حصول ہوتا ہے اور اسی نام کے نہ لینے سے برکت مٹ جاتی ہے'' (18)۔

اللہ تعالی نے اپنے خاص بندوں کو سراہا ہے جنہوں نے رحمت کی صفت اپنائی ہے:

﴿ لَقَدْ جَاءكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾

''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کیلئے شفیق اور رحیم ہے'' (19)۔

صحابہ کرامؓ کو سراہتے ہوئے فرمایا:

﴿ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ ﴾

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں'' (20)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''میری امت پر، میری امت میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والے ابوبکر ہیں'' (21)۔

جنت کو اللہ تعالی نے اپنی رحمت قرار دیا ہے:

اَنْتِ رَحْمَتِیْ ، اَرْحَمُ بِکِ مَنْ أشَاءُ

....

(17) الرحمٰن 78

(18) الصواعق المرسلہ، از علامہ ابن قیمؒ، 2/122

(19) التوبہ 128

(20) الفتح 29

(21) حدیث صحیح: بروایت حضرت انس بن مالکؓ، دیکھئے: مسند احمد 3/281، ترمذی 2981

''تو میری رحمت ہے، تیرے ذریعہ میں جس پر چاہوں رحم کروں'' (22)۔

اس نے اپنے تمام بندوں کے لئے اعلان کروایا ہے کہ:

﴿ نَبِّءْ عِبَادِیْ أَنِّیْ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِیْمُ ، وَ أَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الأَلِیْمَ ﴾

''اے نبی ﷺ، میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک ہے'' (23)۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت وہ صفت ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ الْخَلْق: اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِی

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب لکھ دی تھی کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے جائے گی'' (24)۔

اسی مفہوم کی آیت بھی قرآن مجید میں ہے:

﴿ كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾

اس نے رحم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے'' (25)۔

دنیا میں بڑے فاسق، فاجر، ظالم اور ہزاروں افراد کو قتل کرنے والے لوگ گزرے ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے پاداش میں انہیں دنیا میں ہی پکڑ کیوں نہیں لیتا۔ اس کا

....

(22) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوہریرہؓ، طویل حدیث کا ٹکڑا جسے بخاری 4850، مسلم 2846 نے نقل کیا ہے۔

(23) الحجر 49، 50

(24) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوہریرہؓ، السلسلة الصحیحة 1629، بخاری 7554، مسلم 2751

(25) الانعام 12

جواب ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے:

﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَاماً وَأَجَلٌ مُسَمًّى ﴾

''اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک کلمہ طے نہ کر دیا گیا ہوتا اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا'' (26)۔

مگر وہ کونسا کلمہ ہے جو پہلے سے طے ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے ظالموں کو مہلت دی گئی؟ علمائے کرام کا کہنا ہے کہ وہ کلمہ ہے:

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گی''

علامہ خطابیؒ کا کہنا ہے:

''الرحمٰن وہ ہے جس کی رحمت تمام مخلوق پر چھا گئی ہے۔ ان کا رزق، ان کا معاش اور ان کے تمام اسباب اسی میں داخل ہیں۔ اس کے رحمت کے تحت کافر اور مومن، صالح اور فاجر سب شامل ہیں جبکہ الرحیم صرف مومنوں کے لئے خاص ہے'' (27)۔

''سارے جہان میں کوئی دوسرا اس ہمہ گیر اور غیر محدود رحمت کا حامل نہیں، دوسری جس ہستی میں بھی صفت رحم پائی جاتی ہے اس کی رحمت جزوی اور محدود ہے اور وہ بھی اس کی ذاتی نہیں بلکہ خالق نے کسی مصلحت اور ضرورت کی خاطر اسے عطا کی ہے، جس مخلوق کے اندر بھی اس نے کسی دوسری مخلوق کے لئے جذبۂ رحم اس لئے پیدا کیا ہے کہ ایک مخلوق کو وہ دوسری مخلوق کی پرورش اور خوشحالی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، یہ بجائے خود اس کی رحمت بے پایاں کی دلیل ہے'' (28)۔

....

(26) طہ 129

(27) الجامع لاسماء الله الحسنى، حامد احمد اطاهر، ص 140

(28) تفہیم القرآن، از مولانا سید الابوالاعلیٰ مودودیؒ، 5/412

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حق سبحانہ وتعالیٰ نے جو پہلی بات فرمائی وہ قابل غور ہے:

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا اور روح اس کے سر میں گئی تو اسے چھینک آئی، فرشتوں نے کہا:

اے آدم کہو ''**الحمدلله**''۔

آدم نے کہا: ''**الحمدلله**'' ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَرْحَمُكَ رَبُّكَ يَا آدَم

''اے آدم! تیرا رب تجھ پر رحم کرے گا'' (29)۔

اندازہ کریں کہ تخلیق کے بعد رب سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے جو پہلی بات کی اس میں اپنی رحمت کو ان کے ساتھ شامل کیا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی بہتری کے اسباب پیدا کرتا ہے، خواہ وہ انہیں پسند نہ آئیں یا ان پر شاق گزریں۔ اس کی مثال بیٹے کے ساتھ باپ کی شفقت ہے کہ وہ اس کی تعلیم وتربیت اور تادیب کے لئے اس سے وہ وہ کام کرواتا ہے جو بیٹے پر شاق گزرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کا معاملہ کرتے ہوئے انہیں آزمائشوں میں ڈالتا ہے، انہیں امتحانوں سے گزارتا ہے، انہیں مشکلات سے دوچار کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بندوں کی بہتری کس میں ہے۔

اثر میں آیا ہے کہ آزمائش اور مصیبت میں مبتلا شخص کیلئے جب کوئی دعا کرتا ہے کہ:

یا اللہ اس پر رحم فرما۔

....

(29) تفسیر ابن کثیر، 1/109

تواللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اس پر رحم ہی کر رہا ہوں کہ اس کی بہتری کیلئے اسے میں نے آزمائش میں ڈالا ہے۔

سورہ یاسین کے مردمومن نے کہا:

﴿ إِن يُرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّى شَفَاعَتُهُمْ شَيْئاً وَلا يُنقِذُوْن ﴾

''حالانکہ رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں'' (30)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس مردمومن نے نقصان کیلئے تمام ناموں کو چھوڑ کر رحمٰن کا نام کیوں منتخب کیا؟۔ کیا رحمٰن جس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، وہ اپنے مومن بندوں کیلئے نقصان چاہتا ہے؟ یقیناً نہیں، تو پھر مردِمومن نے نقصان کیلئے رحمٰن نام کا انتخاب کیوں کیا؟۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن بندے کو رحمٰن کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی خیر ملتا ہے، کبھی بظاہر کوئی نقصان بھی پہنچا تو اس میں بندے کیلئے خیر ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بندہ کی نظر اس خیر کی طرف نہیں جا سکتی۔

قرآن مجید کا ایک اور مقام قابل غور ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَآ أَبَتِ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيّاً ﴾

''ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں'' (31)۔

عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑنے کے بجائے کوئی اور مناسب نام جوڑنا چاہئے تھا۔ حضرت

....

(30) یاسین 23

(31) مریم 45

ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ:

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ جبار، قہار یا منتقم کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں''

مگر آپؑ نے خاص طور پر عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑ دیا۔ رحمٰن تو سراسر رحمت ہے مگر عذاب کے ساتھ رحمٰن کا نام جوڑنے میں لطیف نکتہ ہے، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں کہ ابا جان، اللہ تعالیٰ بہت رحم فرمانے والا ہے، اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، وہ رحمٰن اگر کسی کو سزا دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو سزا دی جا رہی ہے اس میں رحمت کے قابل کوئی ذرہ باقی نہیں، اگر رحمت کے قابل کوئی ذرہ ہوتا تو رحمٰن اس پر ضرور رحم کرتا''(32)۔

الرحمٰن الرحیم وہ ہے جو ''برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیئے چلا جاتا ہے اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لئے تیار رہتا ہے''(33)۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے! الرحمٰن وہ ہے جو برسوں کی نافرمانیاں لمحہ بھر میں معاف کر دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل سخت قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہو گئے اور عرض کیا:

اے کلیم اللہ! اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ بارش برسا کر ہمیں پانی سے نوازے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کیا اور صحراء کی طرف نکل گئے۔ وہ سب اللہ کے حضور اکٹھے ہو گئے اور دعائیں مانگنے لگے مگر آسمان سے پانی کی بوند تک نہ گری بلکہ الٹا سورج کی تمازت و حرارت میں تیزی و شدت آ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پھر بارش کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

....

(32) شرح الاسماء الحسنی، شیخ عبد العزیز بن ناصر الجلیل

(33) تفہیم القرآن، 3/480

’’تمہیں بارش سے کیوں نوازوں جبکہ تمہارے درمیان ایک شخص ایسا ہے جو 40 برس سے گناہوں میں مبتلا ہوکر باغی ہوگیا ہے۔اس کی نحوست کی وجہ سے میں نے بارش روک لی ہے۔اس سے کہو کہ وہ تمہارے درمیان میں سے نکل جائے۔وہ جب تک تمہارے درمیان ہوگا بارش نہیں ہوگی‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

’’لوگو! تمہارے درمیان ایک شخص ہے جو 40 سال سے اللہ کی نافرمانی کررہا ہے، اس کی نحوست کی وجہ سے اللہ نے بارش روک لی ہے۔ میں اسے حکم دیتا ہے کہ وہ ہمارے درمیان میں سے نکل جائے۔وہ جب تک نہیں نکلے گا بارش نہیں ہوگی‘‘۔

لوگوں نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کردیا۔وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کون ہے یہ بدبخت، نافرمان اور منحوس جس کی وجہ سے اللہ نے بارش روک لی ہے۔

اس نافرمان بندے نے بھی لوگوں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھا مگر کسی کو اس اجتماع سے باہر جاتے نہ پایا تو اسے یقین ہوگیا کہ خود وہی مطلوب ہے۔اس نے اپنے دل میں کہا:

اگر میں ان تمام لوگوں میں سے اٹھ کر باہر نکل جاؤں تو پورے بنی اسرائیل کی نظر میں میں ذلیل ورسوا ہو جاؤں گا اور اگر میں شرم کے مارے بیٹھا رہا تو میری وجہ سے یہ سب لوگ پیاس سے مرجائیں گے۔وہ یہ سوچ کر بہت ہی دل شکستہ ہوا۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔اس نے اپنے افعال پر ندامت کی وجہ سے اپنا منہ اپنے کپڑوں میں چھپالیا اور اللہ کے حضور یوں عرض گزار ہوا :

یا الٰہی ! اے میرے آقا و مولیٰ ! میں نے 40 سال تک تیری نافرمانی کی۔اس کے باوجود تو نے میری پردہ پوشی کی اور مجھے مہلت دیئے رکھی۔اب میں سرِ تسلیم خم کئے تیرا مطیع وفرمانبردار بن کر تیرے دربار میں حاضر ہوگیا ہوں، میری اس حاضری کو قبول فرما۔میری توبہ قبول کر۔

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ بادلوں کا ایک ٹکڑا اٹھا، آسمان کے وسط میں بلند ہوا اور

اس نے یوں زوردار بارش برسانا شروع کردی جیسے کہ مشکیزوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر تعجب میں مبتلا ہوگئے اور اپنے رب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے:

''اے اللہ! تو نے ہمیں بارش عطا فرمادی جبکہ ہمارے درمیان میں سے کوئی بھی آدمی اٹھ کر باہر نہیں گیا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے موسیٰ! میں نے جس کی وجہ سے بارش روکی تھی، اب اسی کی وجہ سے برسا رہا ہوں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

''یا الٰہی! وہ مطیع وفرمانبردار بندہ مجھے بھی دکھلا دے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے موسیٰ! میرا وہ بندہ جب باغی تھا، اس وقت بھی میں نے اسے رسوا نہیں کیا، اب جبکہ وہ تائب ہوگیا ہے تو اسے کیسے رسوا کروں''۔

مذکورہ واقعہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے مگر اس میں اللہ کی رحمانیت اور رحیمیت کی ایک جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

اللہ کی رحمانیت کے حوالے سے ایک اور واقعہ ملاحظہ کریں:

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہوکر آئے، ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ ماماتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کا حال دیکھ کر لوگوں سے پوچھا:

''کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ میں پھینک دے گی؟''۔

لوگوں نے عرض کیا:

ہرگز نہیں! خود پھینکنا تو در کنار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک اسے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کیلئے رکھتی ہے'' (34)۔

اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی دیکھئے کہ وہ فرعون جیسے باغی اور سرکش کے ساتھ بھی رحم کا معاملہ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون کے پاس بھیجتا ہے، فرماتا ہے:

﴿ اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ﴾

''اب فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے'' (35)۔

فرعون سرکش اور باغی ہو گیا ہے، اس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دیا، وہ زمین پر رب بنا پھرتا ہے مگر اس پر بھی اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے، حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام سے فرماتا ہے:

﴿ فَقُوْلَا لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾

''اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے'' (36)۔

یعنی اتنے بڑے گناہوں کے باوجود اس کیلئے واپسی کا راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ہے اللہ کی شان رحیمی۔

اسرائیلیات میں ہے کہ جب فرعون ڈوب رہا تھا اور مرنے کے قریب تھا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکار پکار کر بچانے کی درخواست کی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکی ایک نہ سنی۔ روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوتے فرمایا:

اے موسیٰ! تو کتنا سنگ دل ہے۔

....

(34) حدیث صحیح: بروایت حضرت عمر بن خطابؓ، بخاری 5999، مسلم 2754

(35) النازعات 17

(36) طہٰ 44

اس نے تمہیں سو دفعہ پکارا مگر تم نے اسے جواب نہیں دیا۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جاہ وجلال کی، اگر وہ مجھے ایک مرتبہ بلاتا تو میں اسے بچا لیتا۔

یہ ہے اللہ کی رحمت فرعون جیسے شخص کے ساتھ جو کہا کرتا تھا:

﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ﴾

''میں تمہارا رب ہوں، سب سے بڑا''

کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اس شخص کے ساتھ کیا حال ہوگا جو دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے حضور سجدہ کر کے کہتا ہے:

سبحان ربی الاعلیٰ

اس رحمت کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے پہلے خود پر رحم کرتے ہوئے اسے جہنم کی آگ سے بچائے، پھر جن کا وہ کفیل ہے، پھر اپنے رشتہ داروں، دوست احباب اور تمام انسانیت پر رحم کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے۔ ہم جنت میں بھی اللہ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم سے کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرسکتا''

پوچھنے والوں نے پوچھا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی نہیں۔

فرمایا:

'' میرا عمل بھی مجھے جنت میں داخل نہیں کراسکتا سوائے اس کے کہ اللہ کی رحمت مجھے گھیر لے''(37)۔

....

(37) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، بخاری 5673، مسلم 2816

گزشتہ صفحات میں اللہ تعالی کے دو مبارک نام ''الرحمٰن الرحیم'' چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو مبارک ناموں میں اتنی وسعت ہے کہ ان پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ایک عرب محقق شیخ ابوعبدالرحمٰن سلطان علی نے ''**الریاض النعیم فی ظل الرحمن الرحیم**'' نامی دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔پہلی کتاب 465 صفحات جبکہ دوسری 632 صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں کتابوں میں انہوں نے ''الرحمٰن الرحیم'' کی تشریح کی ہے۔ یہ قابل قدر کوشش ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے ان دو ناموں کا حق ادا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا۔معلوم ہوا کہ اس پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔گزشتہ صفحات میں اللہ تعالی کے مبارک نام الرحمٰن الرحیم کے جن چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ایک اور مبارک نام پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل ویڈیو ڈی وی ڈی، سی ڈی اور آڈیو کیسٹ میں بھی دستیاب ہے۔

الحق

قارئین کرام!

اسماء اللہ الحسنیٰ کے اس مبارک سلسلے میں ہم نے تمہید کے بعد اب تک **"اللہ، الالہ، الرب، الرحمن اور الرحیم"** کا ذکر کیا ہے اور اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ علمی مباحث سے اجتناب کرتے ہوئے ان ناموں کی تشریح آسان ترین انداز میں کریں۔ ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے رب کو جانیں، پہچانیں اور اس سے محبت کریں۔ جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ ان مبارک ناموں کے حوالے سے ہمارا تصور جتنا واضح ہوگا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق گہرا ہوگا۔ اب اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور مبارک نام **"الحق"** پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"الحق" اور **"حق"** قرآن مجید میں جا بجا آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس نام کا استعمال جن مقامات پر آیا ہے ان میں سے چند کا ذکر ہے:

﴿ ذَلِکَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾

"یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے" (1)۔

﴿ وَرُدُّوا إِلَى اللهِ مَوْلاهُمُ الْحَقِّ ﴾

"سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیئے جائیں گے" (2)۔

....

(1) الحج 6

(2) یونس 30

﴿ فَذَلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ﴾

''تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے''(3)۔

﴿ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴾

''پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا''(4)۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی آیات ہیں جن میں یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ''الحق'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ ''الحق'' کے ضمن میں ہم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ حق کا مطلب کیا ہے؟۔

حق باطل کی ضد ہے۔ حق وہ چیز ہے جس کے وجود کا یقین کامل ہو۔ اس میں ذرا برابر شک نہ ہو، اگر یہ بات ہے تو''الحق''اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وجود سب سے بڑی اور ظاہر حقیقت ہے بلکہ احق الحائق یہ ہے کہ اللہ حق ہے۔ اس کا امر حق ہے، اس کا نہی حق ہے، اس کا ہر ہر فعل حق ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ ، قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَهْدِىٓ إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِى لِلْحَقِّ أَفَمَن يَهْدِىٓ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّىٓ إِلَّآ أَن يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴾

''ان سے پوچھو، تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی، پھر تم یہ کس

....

(3) یونس 32

(4) المومنون 116

الٹی راہ پر چلے جا رہے ہو؟، ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟، کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟، آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو؟''(5)۔

اگر وہ حق ہے، اس کا کہا حق ہے، اس کا ہر فعل حق ہے اور وہی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو پھر حق کی تلاش اس کے سوا کسی اور کے پاس کیسے کی جاسکتی ہے؟۔ کائنات کا نظام حق پر قائم ہے اور جو اس کے خلاف چلے گا وہ کائنات کے خلاف چل رہا ہوگا۔

''اللہ تعالیٰ کا وجود محض ایک خیالی اور فرضی وجود نہیں جسے بعض عقلی مشکلات رفع کرنے کی خاطر مان لیا گیا ہو۔ وہ نرا فلسفیوں کے خیال کا آفریدہ، واجب الوجود اور علت العلل نہیں بلکہ حقیقی فاعل مختار ہے جو ہر آن اپنی قدرت، اپنے ارادے، اپنے علم اور اپنی حکمت سے پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ حق ہے اور اس کا ہر کام سنجیدہ، با مقصد اور پر حکمت ہوتا ہے''(6)۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں حق ہے۔ وہ حق ہے اور حق کو بلند کرنے والا ہے۔ ایمان والوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے، اس کے مقابلے میں ہر طاغوت باطل ہے۔

یہاں ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق اور عدل میں فرق کیا ہے؟

عدل کی تعریف یہ ہے کہ:

ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دیا جائے۔

....

(5) یونس 35

(6) تفہیم القرآن، از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

معلوم ہوا کہ عدل حق کا عملی نفاذ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا نام عادل نہیں بلکہ ''الحق'' رکھا ہے کیونکہ حق عدل سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ''الحق'' نہ ہوتا تو کائنات کا یہ نظام کس طرح چل سکتا تھا۔ کائنات کا نظام حق پر ہی قائم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ﴾

''اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین وآسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا'' (7)۔

اللہ تعالیٰ ''الحق'' ہے، وہ کسی بستی کو کسی بستی پر فوقیت نہیں دیتا، کسی نسل کو کسی نسل سے برتر نہیں سمجھتا، کوئی رنگ اس کے نزدیک دوسرے رنگ سے بہتر نہیں۔

حضرت سے عمرؓ سے منسوب معروف دعا ہے:

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ

''اے اللہ! ہمیں حق، حق بنا کر دکھا اور اس پر چلنا نصیب کر اور باطل، باطل بنا کر دکھا اور اس سے بچنے کی ہمیں توفیق عطا کر'' (8)۔

اس دعا میں کئی لطیف اشارے ہیں۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ حق آپ سے پوشیدہ رکھے۔ وہ حق پر باطل اور باطل پر حق کا لبادہ چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ کوئی آدمی حق کو جانتا ہو اور اس کی اتباع بھی کرے نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے معلوم ہو کہ یہ باطل ہے اور وہ اس سے بچنے کی بھی

....

(7) المومنون 71

(8) منتهى الارادات، از بہوتیؒ 3/497، نیز علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے سورہ البقرہ، آیت 213 کی تفسیر میں بھی اسے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دعا مسنون ہے، دیکھئے: تفسیر ابن کثیر 1/444۔

کوشش کرتا ہو،اسی لئے حضرت عمرؓ نے نہ صرف حق کو حق دکھانے کی دعا فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ ہمارے لئے اس کی اتباع آسان فرمادے نیز باطل کو نہ صرف باطل بنا کر دکھا بلکہ اس سے بچنا آسان کر دے۔

اس دعا میں ایک اور لطیف اشارہ ہے کہ حق کو حق سمجھنا اور پھر اس کی اتباع کرنا اور باطل کو باطل سمجھنا اور اس سے بچنا اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے،اس لئے دعا کے الفاظ میں ''ارزقنا'' آیا ہے۔

حق کے ساتھ انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی اسے چھپاتا ہے،کوئی اس پر باطل کا لبادہ اوڑھ کر پیش کرتا ہے،کوئی حق سے ڈرا ہوا ہے،کوئی باطل کو حق سمجھ بیٹھا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں کہ حق کیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَلاَ تَلْبِسُواْ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُواْ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾

''باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو''(9)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی 8 حقیقتوں کو واضح فرمایا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک دعا سکھائی ہے جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز رات کے آخر پہر میں کیا کرتے تھے۔اگر یہ 8 حقیقتیں ہماری زندگی میں واضح اور حق بن جائیں تو وہ حق واضح ہو جائے گا جس پر زمین اور آسمان کو اللہ تعالیٰ نے استوار کیا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تھی:

''اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْحَقُّ ، وَقَوْلُكَ الْحَقُّ، وَوَعْدَكَ الْحَقُّ، وَلِقَائُكَ الحَقُّ، وَالْجَنَّةُ حَقٌ، وَالنَّارُ حَقٌ، وَالنَبِيُّونَ حَقٌ ، وَمُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم) حَقٌ''

''اے اللہ تو حق ہے، تیرا کہا حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تجھ سے ملاقات حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، انبیاء حق ہیں اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہیں''(10)۔

....

(9) البقرہ 42

(10) حدیث صحیح: براویت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، بخاری 1120 واضح رہے کہ یہ دعا اکثر کتب حدیث میں مختلف ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

ان 8 حقیقتوں کو دل، دماغ، وجدان اور وجود سے تسلیم کیا جائے۔ان 8 حقیقتوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ان 8 حقیقتوں پر ایمان کا کونسا معیار مطلوب ہے۔سیدنا حارثہؓ، رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

''اے حارثہؓ! تمہاری صبح کس حال میں ہوئی؟''۔

حضرت حارثہؓ نے عرض کیا:

''میری صبح اس حال میں ہوئی کہ میں حق اور حقیقی طور پر مومن ہوں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر دعوے کی ایک دلیل ہونی چاہیئے ،تمہارے ایمان کی کیا دلیل ہے؟''۔

حضرت حارثہؓ نے عرض کیا:

''میری صبح اس حال میں ہوئی ہے گویا میں اپنے رب کے عرش کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھے اہل جنت، جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوتے دکھائی دے رہے ہیں اور گویا اہل جہنم ،جہنم کے عذابوں سے دوچار ہوتے نظر آرہے ہیں، اس حال میں میں نے اپنے دن کو بھوک اور پیاس (روزے کی) حالت میں گزارااور رات کو رتجگے (تہجد) کی حالت میں گزارا''۔

اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اے حارثہؓ! تم نے ایمان کی حقیقت کو پالیا ہے، اب اس پر ثابت قدم رہو'' (11)۔

حق کی 8 حقیقتوں پر ایمان کا یہ معیار ہونا چاہیئے کہ گویا ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

....

(11) علامہ ابن رجب حنبلیؒ نے اپنی کتاب ''جامع العلوم والحکم'' میں اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔عقیلیؒ نے ''الضعفاء الکبیر'' میں اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی اصل نہیں جبکہ علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں اس کے ایک راوی یوسف بن عطیہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے مختصر بزار میں لکھا ہے کہ اس حدیث کے شواہد ہیں۔

* اللہ تعالی حق ہے:

حق کی پہلی حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کہے کہ اللہ حق ہے، اگر اللہ حق ہے تو اس کا کہا بھی حق ہے، جب اس کا کہا حق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے ملاقات بھی حق ہوگی، جب اس سے ملاقات بھی حق ہے تو لامحالہ جنت بھی حق ہوگی، جب جنت حق ہے تو جہنم بھی حق ہوگی۔ جب یہ تمام چیزیں حق ہیں تو یہ حقیقتیں ہم تک پہنچانے والے انبیائے کرام علیہم السلام بھی حق ہیں اور جب انبیائے کرامؑ حق ہیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حق ہیں۔ جب یہ تمام چیزیں حق ہیں تو حق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ یہ حقیقتیں اگر ذہن میں واضح ہو جائیں تو زندگی کتنی آسان ہو جائے گی۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقتِ مقررہ تک چلے جا رہے ہیں'' (12)۔

جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا وہ حق ہی ہو سکتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾

''اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے'' (13)۔

کائنات میں جہاں چاہے نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر چیز گواہی دے رہی کہ اسے برحق

....

(12) لقمان 29

(13) التغابن 3

پیدا کیا گیا ہے:

﴿ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ﴾

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''(14)۔

* اللہ تعالی کا کہا حق ہے :

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کہا حق ہے:

﴿ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ ﴾

''اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے''(15)۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ قَوْلُهُ الْحَقُّ ﴾

''اس کا ارشاد عین حق ہے''(16)۔

جب وہ خود حق ہے تو اس کا کہا بھی حق ہونا چاہئے۔ وہ حق بات کہتا ہے اور حق کی دعوت دیتا ہے۔

* اللہ تعالی کا وعدہ حق ہے :

تیسری حقیقت یہ ہے کہ اس کا وعدہ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے ہم سے کئے ہیں وہ سب کے سب حق ہیں، اس کا مشاہدہ وہ دنیا میں بھی کراتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں اس حوالے سے لطیف اشارہ ہے:

....

(14) فصلت 53

(15) الاحزاب 4

(16) الانعام 73

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں جب فرعون بنی اسرائیل کے تمام بچوں کو قتل کررہا ہوتا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوتی ہیں کہ اس بچے کو کسی بھی وقت فرعون کے سپاہی آکر قتل کردیں گے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ:

﴿ وَأَوۡحَيۡنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنۡ أَرۡضِعِيهِ فَإِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَأَلۡقِيهِ فِي الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحۡزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيۡكِ ﴾

''ہم نے موسیٰ کی ماں کواشارہ کیا کہ اس کو دودھ پلا، پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہوتو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف وغم نہ کر، ہم اسے تیرے پاس واپس لے آئیں گے''(17)۔

اور پھر وہی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے خطرہ محسوس کرکے انہیں دریا میں بہادیا۔اس وقت زمینی حقیقت کیا کہہ رہی تھی؟۔بچہ پانی میں بہتا ہوا اسی کے محل کی طرف جارہا ہے جس کے خوف سے اسے پانی میں بہایا گیا تھا،اب اسے موت سے کون بچا سکتا ہے؟ مگر آسمانی حقیقت نے کچھ اور ہی منظر پیش کیا۔واقعات سب کو معلوم ہیں،الختصر وہ بچہ ریاستی آب وتاب کے ساتھ اپنی ماں کو واپس کردیا گیا،کیوں؟اس کی ایک وجہ یہ تھی:

﴿ فَرَدَدۡنَاهُ إِلَى أُمِّهِ كَيۡ تَقَرَّ عَيۡنُهَا وَلَا تَحۡزَنَ ﴾

''اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو''(18)۔

بچے کو ماں کے پاس واپس لانے کی دوسری اور بنیادی وجہ تھی:

....

(17)القصص 7

(18)القصص 13

﴿ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾

''اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا'' (19)۔

اللہ تعالی نے ام موسی علیہ السلام وعدہ کیا تھا کہ اس بچے کو پانی میں بہادے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے تیرے پاس واپس لے آئیں گے، لو ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دکھا دیا کہ وہ جو وعدے اپنے بندوں سے کرتا ہے وہ برحق ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے زمین کی تمکنت اور حکمرانی کا وعدہ کیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِيْ لَا يُشْرِكُونَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں'' (20)۔

اور چشم فلک نے اس وعدے کو بارہا سچا ہوتا دیکھا ہے۔ اہل ایمان اس زمین کے امین، قائد اور حکمراں ہیں، وہ انہیں بارہا اس کی حکمرانی دے چکا ہے اور آج بھی شرائط پورا کرنے پر وہ زمین کی حکمرانی دے گا۔

....

(19) القصص 13

(20) النور 55

* اللہ تعالی سے ملاقات حق ہے:

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، اس کا کہا حق اور اس کا وعدہ حق تو یقیناً اس سے ملاقات بھی حق ہوگی۔

﴿ وَلَوْ تَرَى إِذْ وُقِفُواْ عَلَى رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُواْ بَلَى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوقُواْ الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴾

''کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے، اس وقت ان کا رب ان سے پوچھے گا ''کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟'' یہ کہیں گے ''ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے'' وہ فرمائے گا ''اچھا! تو اب اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو'' (21)۔

* جنت حق ہے:

حق کی پانچویں حقیقت یہ ہے کہ جنت حق ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقّاً فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقّاً قَالُواْ نَعَمْ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ اللّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴾

''پھر جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے کئے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے؟ وہ جواب دیں گے ''ہاں'' تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ان ظالموں پر'' (22)۔

* جنھم حق ہے:

چھٹی حقیقت یہ ہے کہ دوزخ حق ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَى وَرَبِّنَا ﴾

....

(21) الانعام 30

(22) الاعراف 44

''جس روز کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اس وقت ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ حق نہیں؟ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم یہ واقعی حق ہے''(22)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا:

﴿ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ، لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾

''فرمایا تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں تیری پیروی کریں گے''(24)۔

*انبیاء علیہم السلام سمیت رسول اکرم ﷺ حق ہیں:

ساتویں حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام حق تھے اور آٹھویں حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت حق تھی۔ رسول اکرم ﷺ کی دعوت احقاق الحق کی دعوت تھی۔ فرمایا گیا:

﴿ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ ﴾

''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے''(25)۔

جب یہ تمام حقیقتیں ہمارے دلوں میں زندہ ہو جائیں تو ایک نئی حقیقت کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ حق ہے، اس کا کہا حق ہے، اس کا وعدہ حق ہے، اس سے ملاقات حق ہے، جنت اور دوزخ حق ہیں اور انبیاء سمیت رسول اکرم ﷺ حق ہیں تو پھر مجھے کس لئے پیدا کیا گیا، ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اس حقیقت کو تلاش کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ

....

(23) الاحقاف 34

(24) ص 84، 85

(25) البقرہ 119

الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴾

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں، پس بالا و برتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی، کوئی خدا اس کے سوا نہیں، مالک ہے عرش بزرگ کا'' (26)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ، مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

''یہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں، ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں'' (27)۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اس کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ زمین میں عدل قائم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کو قائم کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے مخاطب ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾

''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی، جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں

....

(26) المؤمنون 115، 116

(27) الدخان 38، 39

یقیناً ان کیلئے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے'' (28)۔

معلوم ہوا کہ خلیفہ کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب کے طور پر اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل قائم کرے اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرے، خواہش نفس کی پیروی اسے اللہ تعالیٰ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ ہونا چاہئے۔ اسی کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے۔

خلیفہ کا مطلب سمجھنے کیلئے ہمیں تخلیقِ آدم علیہ السلام کی طرف جانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کرنا چاہی تو فرشتوں سے کہا:

﴿ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'' (29)۔

خلیفہ کا مطلب کیا ہے؟۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کی منشا کو پورا کرنا ہے۔

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ کرنا، اس کی توحید کے تقاضے پورے کرنا اور اس کے بندوں کے درمیان عدل قائم کرنا خلیفہ کا کام ہے۔

امام فخر الرازیؒ کا کہنا ہے:

''خلیفہ اس لئے کہا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتے ہوئے بندوں کے درمیان عدل کے ساتھ

....

(28) ص 26

(29) البقرہ 30

فیصلے کرے''(30)۔

''خلیفہ اس لئے کہا گیا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے حدود اور قوانین نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے''(31)۔

زبان میں خلیفہ کا مطلب ہے:

''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام، بعد میں آنے والا، قائم مقام، جانشین، نائب''(32)۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں کہ:

''انسان مطلق التصرف نہیں کہ وہ جو چاہے کرتا رہے اور اس کا مؤاخذہ نہ ہو بلکہ وہ اپنے خالق کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ زمین کو آباد کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ خلیفہ کا مقام دے کر اس کی عزت و تکریم کی گئی جس پر سفلی اور علوی مخلوقات نے اس پر رشک کیا''۔

واضح رہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یعنی نائب ہے اور دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کا سب سے قریبی شخص اس کا نائب ہوتا ہے۔ یہ دنیا اس کے لئے پیدا ہوئی، آخرت اس کے لئے دارالجزاء قرار پائی، شیطان اس پر تکبر کرنے کے باعث ملعون ہوا اور فرشتے اس کی تکریم میں سجدہ ریز ہوئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لئے اس کی جگہ لے۔ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملے میں کچھ

....

(30) مفاتیح الغیب، از علامہ رازیؒ۔

(31) تفسیر فتح البیان۔

(32) فیروز اللغات

اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ وہ ان اختیارات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا وہ مطلق العنان بن کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے''(33)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان فضول پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے جس کے ذمہ کچھ کام ہیں جنہیں ادا کر کے وہ آخرت میں سرخرو ہوگا یا ان میں کوتاہی برتنے پر سزا کا مستحق ٹھہرایا جائے۔اللہ تعالیٰ'' الحق '' ہے اور اس کا حق ہے اس کا نظام دنیا میں چلے،اس کا حکم مانا جائے اور اس کی اطاعت و بندگی کی جائے۔انسان'' الحق '' کا خلیفہ اور نائب ہے اور اس پر فرض عائد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتے ہوئے زمین میں عدل کرے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ کُونُواْ قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَی أَنفُسِکُمْ أَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالأَقْرَبِیْنَ إِن یَکُنْ غَنِیّاً أَوْ فَقَیْراً فَاللّهُ أَوْلَی بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَی أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِیْراً﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر کیوں نہ پڑتی ہو،فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب،اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو،اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے''(34)۔

اقامت عدل کے حوالے سے اسلامی تاریخ روشن ہے۔مخزوم قبیلے سے تعلق رکھنے والی ایک عورت نے چوری کی تو لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ اتنے بڑے قبیلے سے تعلق رکھنے والی عورت کے ہاتھ

....

(33) تدبر القرآن

(34) النساء135

کاٹے جائیں۔لوگوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کرنے کیلئے رسول اکرم ﷺ کا پاس روانہ کیا۔حضرت اسامہؓ کی سفارش پر رسول اکرم ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا:

''تم مجھ سے اللہ کے حدود کے متعلق سفارش کرنے آئے ہو؟ اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا'' (35)۔

عدل اور حق کے علمبردار انصاف کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں خواہ اس کی زد خود ان پر کیوں نہ پڑتی ہو۔فتح سمرقند حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ہوا۔فوج نے سمرقند کے باسیوں کو تین دن کی مہلت دی مگر مہلت کے دوران ہی فوج نے حملہ کر کے شہر کو فتح کر لیا۔اہالیان سمرقند حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دربار میں حاضر ہوئے اور شکوہ کیا کہ مسلمان فوج نے انہیں تین دن کی مہلت دی مگر مہلت کے دوران ہی ان پر حملہ کر کے شہر کو فتح کر لیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مفتوحہ شہر سے فوج کو انخلاء کا حکم دیا۔اس طرح کے واقعات سے اسلامی تاریخ روشن ہے۔

حق کے علمبردار جب حق کا علم لے کر اٹھتے ہیں تو دنیا کی مخالفت انہیں حق کی علمبرداری سے نہیں روک سکتی۔رسول اکرم ﷺ نے قریش کی تمام تر مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کو نہیں چھوڑا۔سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے وفد کے جواب میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تب بھی میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا'' (36)۔

....

(35) حدیث صحیح: بروایت حضرت عائشہؓ مسلم 1688، بخاری 4304

(36) حدیث ضعیف: بروایت یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ، علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے، دیکھئے: السلسلة الضعیفه 909، نیز ''فقه السیره'' میں بھی اسے ضعیف کہا گیا، دیکھئے: فقه السیره 109

اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کا تقاضا یہ ہے کہ اسے غالب کیا جائے۔حق ،حق ہے اوراس کا حق ہے کہ اسے غالب کیا جائے۔حق دراصل غالب ہونے کیلئے ہی آیا ہے۔

اس وقت مسلم امہ جس کسمپرسی کے عالم میں ہے اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس نے حق کو غالب کرنے کی جدو جہد کو ترک کر دیا ہے۔آج دنیا کو نظر آ رہا ہے کہ باطل کا غلبہ ہے اور حق مغلوب ہے مگر باطل کا یہ غلبہ جھاگ کے سوا کچھ نہیں۔اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَّابِياً وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاء حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاء وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الأَمْثَالَ ﴾

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لئے لوگ پگھلایا کرتے ہیں،اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے،جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین پر ٹھہر جاتی ہے،اسی طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے''(37)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین میں باقی رہنے والی چیز ہی حق ہے کیونکہ وہی لوگوں کیلئے نافع ہے۔

جب آدمی حق کا علمبردار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتے ہوئے حق کو ظاہر کرتا ہے:

﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ﴾

''ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے''(38)۔

....

(37)الرعد 17 (38)الانبیاء 18

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سواری پر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے اور اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟‘‘۔

میں نے عرض کیا:

’’اللہ اور رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں‘‘۔

فرمایا:

’’اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں سزا نہیں دے گا‘‘ (39)۔

اس حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ حق قیامت تک کے لئے رہے گا۔ جس دن اس زمین سے حق اٹھ گیا، اسی دن قیامت برپا ہوگی۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں بھی دستیاب ہے۔

....

(39) حدیث صحیح: بروایت حضرت معاذ بن جبلؓ، ابن ماجہ 3487، علامہ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

الجبار

سورۃ الحشر کی آیت 23 میں فرمایا گیا:

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

''وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں''۔

الجبار اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں مذکورہ آیت میں ہوا ہے۔ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نام کو سن کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اس کا مطلب جبر، عظمت، کبریائی وغیرہ ہی ہے۔ عام آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے اس مبارک نام میں بے کسوں، مجبوروں، محتاجوں اور مریضوں کیلئے انتہائی رحمت وشفقت پوشیدہ ہے۔

الجبار کا مادہ ''جبر'' سے ماخوذ ہے جس کے 4 معانی ہیں۔

* اولاً: جبر، یعنی اکراہ اور زبردستی۔

* دوم: عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی۔

عربی زبان میں کھجور کے اس درخت کو جبار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کے پھل توڑنا کسی کے لئے آسان نہ ہو۔ اسی طرح کوئی کام جو بڑا عظیم الشان ہو وہ ''عملِ جبار'' کہلاتا ہے۔

* سوم: الجبار کا مطلب کبریائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا'' (1)۔

یعنی مجھے تکبر کرنے والا نہیں بنایا۔

* چہارم: اصلاح، یعنی وہ جو فقر سے غنا دیتا ہے، ٹوٹے کو جوڑتا ہے، مریض کو شفا دیتا ہے، ضعیف اور کمزور کو تقویت دیتا ہے، محتاج و بے کس اور مجبور کی مدد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے طور پر یہ نام قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر آیا ہے (2) جبکہ رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی یہ نام اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، رسول رحمت ﷺ کا گرامی قدر ارشاد ہے:

تَكُونُ الْاَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُبْزَةً وَاحِدَةً ، يَتَكَفَّأُهَا الْجَبَّارُ بِيَدِهِ كَمَا يَتَكَفَّأُ اَحَدُكُمْ خُبْزَتَهُ فِيْ السَّفَرِ

''قیامت کے دن یہ زمین الجبار کی مٹھی میں اس طرح ہوگی جس طرح تم سفر کے وقت روٹی اپنی مٹھی میں پکڑتے ہو'' (3)۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں:

''ایک رات میں نے رسول اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے الفاتحہ کے بعد سورہ البقرہ کی تلاوت کی، کوئی رحمت کی آیت ایسی نہیں تھی جس پر رک کر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال نہیں کیا اور کوئی عذاب کی آیت ایسی نہیں تھی جس پر رک آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے پناہ نہیں مانگی۔ بعد ازاں آپ ﷺ رکوع میں گئے تو جس قدر آپ ﷺ نے قیام کیا اسی قدر رکوع کیا،

....

(1) مریم 32

(2) سورہ الحشر کی آیت 23

(3) حدیث صحیح: صحیح الجامع از علامہ ناصر الدین البانیؒ 2988

آپ ﷺ رکوع میں یہ دعا کرتے رہے:

سُبْحَانَ ذِیْ الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَکُوْتِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْعَظَمَۃ

''پاک ہے وہ ذات جو جبروت، ملکوت، کبریائی اور عظمت والی ہے''۔

بعدازاں آپ ﷺ سجدے میں گئے اور آپ ﷺ نے قیام جتنا سجدہ کیا، اس میں بھی آپ ﷺ وہی دعا دہراتے رہے''(4)۔

حدیث بالا میں جہاں ''الجبار'' کا بطور اسماء الحسنیٰ ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تہجد کی نماز ہوگی جس میں آپ ﷺ کا رکوع اور سجود اس قدر طویل تھا جس قدر وقت سورہ البقرہ کی تلاوت میں لگتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک اور دعا کے الفاظ ہیں:

''اے اللہ تعالیٰ! اے جبار، اے زبردست قوت وطاقت والے، تجھے یاد کرنے میں، تیرا شکر ادا کرنے میں اور تیری احسن طریقے سے عبادت کرنے میں ہماری مدد فرما''(5)۔

ان مبارک حدیثوں میں بھی ''الجبار'' بطور اسم اللہ تعالیٰ استعمال ہوا ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ الجبار کے 4 مفہوم ہیں۔ پہلا اکراہ اور زبردستی۔ دوسرا عزت، جبروت، عظمت، بلندی اور برتری۔ تیسرا کبریائی اور چوتھا اصلاح۔ اب آیئے ان معانی کی تشریح کرتے ہیں:

جبر، اکراہ اور زبردستی:

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظم ونسق بزورِ دست قائم کر رکھا ہے۔ وہ اپنے ارادے کو جو سراسر حکمت پر

....

(4) حدیث صحیح: بروایت حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ، مسند احمد 6/24، ابوداؤد 873، نسائی 1132

(5) یہ دعا بلفظہ محمد ایوب سپرا کی کتاب ''الاسماء الحسنیٰ'' صفحہ 90 سے نقل کی گئی ہے۔ موصوف نے اسے احمد اور ابوداؤد سے ماخوذ قرار دیا ہے جبکہ یہ حدیث مجھے کہیں نہیں ملی۔

مبنی ہوتا ہے جبراً نافذ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاء وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴾

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، دونوں نے کہا: ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح'' (6)۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾

''وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ حکم دے کے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے'' (7)۔

فرشتوں پر اس کا جبر دیکھئے:

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ﴾

''بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں'' (8)۔

رب سبحانہ وتعالی جو الجبار ہے، اس نے اپنا جبر فرشتوں پر بھی نافذ کر رکھا ہے حالانکہ فرشتوں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے:

اُذِنَ لِیْ اَنْ اُحَدِّث عَنْ مَلَکٍ مِنْ مَلائِکَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی حَمَلَةِ الْعَرْشِ، مَابَیْنِ شَحْمَةِ اُذُنِه اِلٰی عَاتِقِهٖ مَسِیْرُةُ سَبْعِمَائَةَ سَنَة

....

(6) حم سجدہ 11

(7) یٰسین 82

(8) الرعد 13

’’مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں عرش اٹھانے والے فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے بارے میں بتاؤں، اس کے کندھے اور کان کی لو کے درمیان 700 سال کے سفر کی مسافت ہے‘‘(9)۔

معلوم ہوا کہ اتنا عظیم فرشتہ ہے جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہی جبر تمام کائنات پر نافذ ہے، اس نے انسان وجن کو چیلنج کیا ہے:

﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴾

’’اے گروہِ جن وانس! اگر تم زمین اور آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دیکھو، نہیں بھاگ سکتے، اس کے لئے بڑا زور چاہئے‘‘(10)۔

کائنات کی ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا جبر چل رہا ہے مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لئے تو پیدا کیا مگر اسے عبادت پر مجبور نہیں کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو زمین پر تمام انسان مومن بن جاتے مگر اس نے اختیار کی آزادی عطا کی ہے تاہم اس کی مشیت نافذ ہے لہذا مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو تسلیم کرے۔

اثر میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

’’میرے بندے! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت اور ہوگا وہی جو میری چاہت ہے، اگر تو نے حوالے کیا اپنے آپ کو اس کے جو میری چاہت ہے تو میں وہی کروں گا جو تیری چاہت ہے اور

---

(9) حدیث صحیح: بروایت حضرت جابر بن عبداللہؓ، صحیح الجامع از علامہ ناصر الدین الالبانیؒ 854، نیز اسے امام ابوداؤد نے بھی نقل کرتے ہوئے اس پر خاموشی اختیار کی اور اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں کہا جس حدیث پر خاموشی اختیار کی جائے وہ صحیح ہے۔ دیکھے: ابوداؤد 4727، العلو 97، مجمع الزوائد 1/85

(10) الرحمٰن 33

اگر تو نے نہ کیا وہ جو میری چاہت ہے تو میں تجھے تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے، پھر بھی ہوگا وہی جو میری چاہت ہے‘‘(11)۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے انسان سراسر بے بس ہے۔مومن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کو برضا ورغبت تسلیم کرے۔روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار تھا۔اس نے پہاڑ کی کھوہ میں اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔وہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل تھا،لوگ بھی اس کی نظروں سے دور تھے۔اس کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے وہ وضو کرتا،اپنی تشنگی دور کرتا اور نباتات سے اپنی غذا حاصل کرتا تھا۔دن کو روزے سے رہتا اور رات اللہ تعالیٰ کو عبادت میں گزارتا۔اس کا ہر پل اور ہر لمحہ اطاعت و بندگی کی نذر ہوتا تھا چنانچہ سعادت و کامرانی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عبادت گزار کی خبر ہوئی تو آپؑ ایک دن اس کے پاس پہنچے لیکن اسے نماز اور ذکر و اذکار میں مشغول دیکھ کر واپس چلے گئے، پھر رات کو اس کے پاس گئے تو اسے عزیز و غفار رب العالمین کے دربار میں سرگوشی و مناجات میں مگن پایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا اور فرمایا:

’’جناب والا! اپنے آپ پر نرمی کیجئے!‘‘۔

عبادت گزار بندے نے کہا:

’’اے اللہ کے نبی! مجھے خدشہ ہے کہ مبادا اچانک غفلت میں انتقال کر جاؤں اور اپنے پروردگار کے حضور مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

’’کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟‘‘۔

....

(11) یہ بے اصل ہے۔بعض مشائخ اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔

عبادت گزار نے کہا:

''آپ میرے لئے پروردگار سے اس کی رضا وخوشنودی کی دعا کر دیں اور میری یہ التجا بھی پہنچا دیں کہ وہ مجھے زندگی بھر صرف اپنی ہی خوشنودی کے کاموں میں مشغول رکھے حتیٰ کہ میں اس سے جاملوں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب رب سبحانہ وتعالیٰ سے ملاقات اور شرف کلام حاصل کرنے گئے تو دعا و مناجات میں مشغول ہو گئے اور اپنے مولیٰ سے لذتِ کلام میں اس قدر ڈوب گئے کہ اُس عبادت گزار کی باتیں یاد ہی نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا:

''آپ سے میرے عبادت گزار بندے نے کیا کہا تھا؟''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

''میرے پروردگار! تو ہی زیادہ جانتا ہے۔ اس نے تیری رضا وخوشنودی طلب کی ہے اور یہ درخواست بھی کی ہے کہ اس کی زندگی تیری ہی یاد میں گزرے حتیٰ کہ وہ تیرے دربار میں حاضر جائے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

''اے موسیٰ! اس عبادت گزار کے پاس جایئے اور کہیئے کہ رات دن جتنی عبادت چاہے کر لے لیکن ہے وہ بہر حال جہنمی کیونکہ میرے صحیفے میں اس کا نام گناہ گاروں کی فہرست میں درج ہے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس عابد کے پاس گئے اور پروردگار کے فیصلے سے اسے آگاہ کیا تو عابد نے کہا:

''سبحان اللہ! میں اپنے پروردگار کے فیصلے کو خوش آمدید کہتا ہوں، ہر چیز میرے پروردگار کے فیصلے کے مطابق رواں دواں ہے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کے فیصلے کو کوئی روک نہیں سکتا''۔

یہ کہہ کر وہ عبادت گزار زور زور سے گریہ وزاری کرنے لگا...... پھر کچھ دیر کے بعد بولا:

''اے موسیٰ! میرے پروردگار کے جاہ وجلال اور عزت وشان کی قسم! میں اس کے در سے پلٹنے والا

نہیں اور اس فیصلے کو سن کر ہر گز مایوس نہیں بلکہ اب اپنے پروردگار سے میری محبت دوبالا ہوگئی ہے''۔

کچھ عرصے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ اپنے پروردگار سے دعا و مناجات میں مشغول ہوئے تو عرض کیا:

''میرے رب! جو کچھ تیرے عبادت گزار بندے نے کہا ہے اس سے تو اچھی طرح واقف ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے موسیٰ! میرے اس بندے کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ وہ جنتی ہے۔ میری رحمت نے اسے جالیا۔ اُسے یہ بھی بتا دیجئے کہ اس نے میرا یہ خوش کن فیصلہ اپنے صبر و رضا کے عوض حاصل کیا ہے کیونکہ میرا سابقہ کڑوا فیصلہ سن کر بھی وہ چیں بہ جبیں نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ آسمان و زمین بھر گناہ بھی ساتھ لائے تب بھی میں اسے بخش دوں گا، میں کریم اور غفار ہوں''۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خوشخبری اس عبادت گزار کو سنائی تو وہ سجدے میں گر گیا، پروردگار کی حمد و ثنا کرنے لگا پھر اس طویل سجدے ہی میں اُس نے اپنی جان، جاں آفریں کے حوالے کر دی(12)۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ عبادت گزار بندے کو جب اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام جہنمیوں میں لکھ دیا ہے تو اس نے قضائے الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت قرار دیا نیز یہ بھی کہا:

''اے موسیٰ! میرے پروردگار کے جاہ و جلال اور عزت و شان کی قسم! میں اس کے در سے پلٹنے والا نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو سن کر اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اسے گھیر لیا اور اس کا نام جنتیوں میں شامل کر لیا۔ اس واقعے میں سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں، ان فیصلوں کو ہم آہ و زاری سے تبدیل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو

....

(12) یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے جبکہ اسرائیلی روایات کے بارے میں حکم ہے کہ نہ اس کی تصدیق کرو نہ اس کی تکذیب کرو۔

پھر مشیت الٰہی کو قبول کیا جائے اور اس کی حکمت پر صبر کیا جائے کہ اس میں ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے۔

عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی:

الجبار کا دوسرا مفہوم عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ﴾

''اللہ تعالیٰ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں'' (13)۔

اس کی جباریت دیکھئے کہ جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ ارشاد ہوا:

﴿ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء ﴾

''کہو اے اللہ! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے'' (14)۔

اس سے کون پوچھ سکتا ہے:

﴿ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴾

''وہ اپنے کاموں کے لئے کسی کے آگے جواب دہ نہیں اور سب جواب دہ ہیں'' (15)۔

اللہ تعالیٰ عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی والا ہے جبکہ تمام مخلوق اس کے محتاج ہیں، کوئی نہیں جو اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکتا ہو۔

....

(13) الرعد 41

(14) آل عمران 26

(15) الانبیاء 23

کبریائی:

الجبار اللہ تعالیٰ کے لئے صفت مدح ہے جبکہ انسانوں کے لئے یہ صفت مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ ''الجبار'' اسلئے ہے کہ وہ اپنی صفات میں کامل واکمل ہے جبکہ انسان ناقص اور محکوم ہے، مکھی اسے پریشان کردیتی ہے، مچھر اسے نقصان دے سکتا ہے، وہ بھوک کے آگے مجبور ہے اور خواہشات کا غلام ہے۔ انسان جب جبار اور متکبر بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سخت ناپسندیدہ ہوجاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد میں یہ صفت پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے عبرت کا نشان بنادیا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ﴾

''اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو'' (16)۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت سزا دے کر فرمایا:

﴿ وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُواْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْاْ رُسُلَهُ وَاتَّبَعُواْ أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴾

''یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمنِ حق کی پیروی کرتے رہے'' (17)۔

انسان جب دنیا میں جبار بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگادیتا ہے:

﴿ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾

''اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگادیتا ہے'' (18)۔

سورہ ابراہیم میں فرمایا:

....

(16) الشعراء 130

(17) ہود 59　　(18) المومن 35

﴿ وَاسۡتَفۡتَحُوۡا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ﴾

''انہوں نے فیصلہ چاہا تھا تو یوں ان کا فیصلہ ہوا اور ہر جبار دشمنِ حق نے منہ کی کھائی'' (19)۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''قیامت کے دن جہنم سے ایک سر نکلے گا جس کی دو آنکھیں ہوں گے جن سے وہ دیکھے گا، دو کان ہوں گے جن سے وہ سنے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا، وہ کہے گا مجھے تین قسم کے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے، ہر جبار اور تکبر کرنے والے کے لئے، اس شخص کے لئے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور بھی الٰہ بنالیا اور تصویریں بنانے والوں کے لئے'' (19)۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان مکالمہ ہوا تو دوزخ نے کہا:

''مجھے تکبر اور زمین میں جبار بننے والوں کے لئے بنایا گیا ہے'' (20)۔

اللہ تعالیٰ کو '' قاسم الجبابرة'' بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ جو دنیا میں ہر جبار کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ دنیا میں کئی جبار بنے جنہیں اللہ تعالی نے عبرت کا نشان بنا دیا۔ ان میں سے ایک نمرود بھی تھا جو ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا تھا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہے تو اس نے کہا:

﴿ قَالَ أَنَا أُحۡيِـي وَأُمِيتُ ﴾

''زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے'' (21)۔

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ چار افراد ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں پر حکومت کی تھی۔ ان میں

....

(19) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، مسند احمد 2/336، ترمذی 2574

(20) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، بخاری 4850، مسلم 2846

(21) البقرہ 258

سے دومومن (حضرت سلیمان علیہ السلام اور اور ذوالقرنینؒ) اور دو کافر (نمرود اور بخت نصر) تھے۔نمرود ان چار میں سے ایک تھا جس نے پوری دنیا پر حکمرانی کی تھی۔اللہ تعالی نے اس کے غرور کو خاک میں ملانے کیلئے اس پر اپنی ایک حقیر مخلوق مچھر کو مسلط کر دیا جو اس کی ناک سے دماغ میں گھس گئی۔اس کی وجہ سے نمرود کا سر درد کی وجہ سے پھٹا جاتا تھا۔اسے اس وقت سکون ملتا تھا جب سر پر جوتے پڑتے تھے۔ انہی جوتوں کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا ہے:

''کبریائی اور عظمت میری چادریں ہیں، جو مجھ سے میری چادر چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں پھینک دوگا''(22)۔

اصلاح کرنے والا:

الجبار کا چوتھا مفہوم یہ ہے: جو اپنے بندوں کے معاملات کی اصلاح کرتا ہے۔فقیر کا جبر غنا ہے، ٹوٹے ہوئے دل کا جبر جوڑنا ہے، ضعیف کا جبر قوت دینا ہے، مریض کا جبر شفا ہے، بے کس، مجبور، محتاج کا جبر اس کی ضرورت پورا کرنا ہے۔ان تمام باتوں میں اللہ تعالیٰ ''الجبار'' ہے، یعنی وہ جو اپنے بندوں کے معاملات کی اصلاح کرتا ہے۔

انسان کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو ڈاکٹر اس پر پلاستر چڑھا دیتے ہیں۔اس پلاستر کو عربی زبان میں ''جبیرہ '' کہا جاتا ہے۔جبار انسان کے لئے مذموم ہے جبکہ اللہ کے لئے محمود صفت ہے۔

جبار ٹوٹے ہوؤں کو جوڑنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ نام غمزدوں، بے کسوں، مظلوموں، یتیموں، بے آسراؤں اور بے سہاروں کے لئے ہے۔ جبار وہ ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جبار کا اصل جبیرہ سے نکلا ہے اور جبیرہ پلاستر کو کہتے ہیں جو ہڈی ٹوٹ جانے پر چڑھایا جاتا ہے۔انسان

....

(22)حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، صحیح الجامع، از علامہ ناصر الدین الالبانیؒ 4311

کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور دل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہڈیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جوڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔

مشہور دعا ہے:

یَا جَابِرَ کُلِّ کَسِیْر

''اے ٹوٹے ہوؤں کو جوڑنے والے''۔

دو سجدوں کے درمیان رسول اکرم ﷺ کی دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ، وَ ارْحَمْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ

''یا اللہ میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم کر، میری اصلاح فرما، مجھے بلندی عطا کر، مجھے ہدایت دے، مجھے عافیت اور رزق عطا کر'' (23)۔

جابر اور جبار میں فرق یہ ہے کہ جابر وہ ہے جو ایک آدھ مرتبہ آپ کی اصلاح اور مدد کرے مگر جبار وہ ہے جس کی طرف جب جب آپ رجوع کریں وہ آپ کی مدد اور اصلاح کرے گا۔ انسان کا نام جابر تو ہوسکتا ہے مگر جبار نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں کوئی بے کس، منکسر اور مجبور الجبار سے رجوع کرے گا تو وہ اس کی بے کسی کو دور کردے گا مگر ستم یہ ہے کہ کوئی ٹوٹ جائے مگر الجبار سے رجوع نہ کرے۔

دل جب ٹوٹ جائے تو انکساری سے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش آنا چاہئے اور انکساری کی تعلیم خود رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں ملتی ہے۔ طائف کا واقعہ ہمارے کے سامنے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہاں جو ستم پیش آیا تھا اس وقت آپ ﷺ کی عمر 50 سال تھی۔ آپ ﷺ نے اس وقت جو دعا کی اس میں کمالِ انکساری تھی:

'' اَللّٰھُمَّ اَشْکُوْ اِلَیْکَ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّۃَ حِیْلَتِیْ ، وَھَوَانِیْ عَلَیٰ النَّاس ....''

....

(23)حدیث صحیح: بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ، جامع ترمذی 284، ابن ماجہ 898

''اے اللہ میں تجھ سے اپنی کمزوری، بےبسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں''۔

گویا طائف والوں کے رویئے سے آپ ﷺ کا دل ٹوٹ گیا تھا مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا جبر دیکھئے ،اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو پیغام دے رہے ہوں کہ اگر زمین والوں نے آپ ﷺ کی قدر نہ کی تو آسمان والوں کے ہاں آپ ﷺ کی بڑی قدر ومنزلت ہے۔

اسرائیلیات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا:

''یارب میں تمہیں تلاش کرنا چاہوں تو کہاں پاؤں گا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ

''میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل ٹوٹ جاتے ہیں''۔

انسان بسا اوقات ایسے حادثات سے دوچار ہوتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو کیسے سنبھال رکھا ہے۔ ایسے لوگ بارہا ہم نے دیکھے جن کے تمام احباب ایک ہی حادثے میں جاں بحق ہو جاتے ہیں اور سب کی لاشوں کو وہ کندھا دیتا ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اتنا بڑا سانحہ وہ کیسے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ میں تجھے تلاش کرنا چاہوں تو کہاں پاؤں گا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

میں ان کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل ٹوٹ جاتے ہیں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں تو وہ بکھر جائیں گے''(24)۔

اثر میں آیا ہے کہ:

....

(24)اسرائیلی روایت

''کمزور اور بے کس اللہ کی نگرانی میں ہوتے ہیں''۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

''اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے ساتھ اٹھا''(25)۔

الجبار کے دو پہلو ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے جبار یعنی جوڑنے والا ہے اور وہ دنیا میں متکبر بننے والوں پر جبار یعنی توڑنے والا ہے۔

اللہ تعالی کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ ہے اس لئے والدین کے ساتھ انکساری سے پیش آنا چاہئے۔ جبار کا لفظ قرآن مجید میں دو مرتبہ والدین کے حوالے سے آیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زبانی:

﴿ وَبَرّاً بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّاراً عَصِيّاً ﴾

''وہ اپنے والدین کا حق شناس تھا، وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان''(26)۔

اور دوسری مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی:

﴿ وَبَرّاً بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّاراً شَقِيّاً ﴾

....

(25) اس حدیث پر محدثین کلام کیا ہے۔ یہ حدیث بلفظہ سنن ترمذی میں ہے جسے حضرت انسؓ سے روایت کیا گیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ حدیث غریب ہے، دیکھئے: سنن ترمذی 2352۔ امام ابن ماجہ نے اسے اپنی کتاب میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کی اکثریت نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اسے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے جس کی سند ثابت نہیں کیونکہ اس کے رواۃ میں یزید بن سنان ہے جو بہت ہی کمزور ہے۔ واضح رہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں مسکین کا مطلب مفلسی نہیں بلکہ تواضع اور انکساری ہے۔

(26) مریم 14

''اوراپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا'' (27)۔

معلوم ہوا کہ والدین کے ساتھ جبار بن کر پیش آنے کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ہمیں اللہ تعالی کے مبارک نام الجبار کے بارے میں معلوم ہوا کہ الجبار کے چار معانی ہیں۔

* اولاً: جبر، یعنی اکراہ اور زبردستی۔

* دوم: عزت، جبروت، عظمت، بلندی، برتری اور بے نیازی۔

* سوم: الجبار کا مطلب کبریائی ہے۔

اور الجبار کا چھوتھا اور سب سے خوبصورت مطلب ہے:

* اصلاح، یعنی وہ جو فقر سے غنا دیتا ہے، ٹوٹے کو جوڑتا ہے، مریض کو شفا دیتا ہے، ضعیف اور کمزور کو تقویت دیتا ہے، محتاج و بے کس اور مجبور کی مدد کرتا ہے۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی شکل میں بھی دستیاب ہے۔

....

(27) مریم 32

الفتاح

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام الفتاح ہے۔ یہ مبارک نام ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دلاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ، وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾

''کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے''(1)۔

''الفتاح'' اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ہے جس کا مطلب مشکلوں کو حل کرنے والا، مزاحمتوں کو دور کرنے والا، وہ جو اپنے بندوں پر رحمتوں کے دروازے کھولتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ الفتاح زبردست حاکم اور ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو کھولنے کا حکم دیتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کا کہنا ہے:

''حق و باطل کھول کر بیان کرنے والا، حق کو ظاہر اور باطل کو گم کرنے والا، حکم دینے والا اور جسے کوئی حکم نہ دیتا ہو۔ الفتاح وہ ہے جو دل کو حق کے لئے کھولتا ہے اور زبان پر علوم جاری کرتا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فیصلہ کرتا ہے، جو صادقین کا صدق اور کاذبین کا کذب ظاہر کرتا ہے''۔

علامہ خطابیؒ کہتے ہیں:

....

(1) سبا 26

''الفتاح وہ ہے جو اپنے بندوں کیلئے رزق کے دروازے کھولتا ہے''۔

ان اجمالی معانی ومفاہیم کو سامنے رکھا جائے تو الفتاح کے تین تفصیلی معانی واضح ہوتے ہیں:

* پہلا مفہوم:

الفتاح وہ ہے جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے۔

* دوسرا مفہوم:

وہ جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

* تیسرا مفہوم:

الفتاح اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

اب آیئے پہلے مفہوم پر غور کرتے ہیں:

جب بندہ مسائل، مشکلات اور مصیبتوں کے طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو کون ہستی ہے جو اسے ان پریشانیوں سے نجات دلاتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر مشکلات کو دور کرتے ہوئے اپنے بندے کی مدد کرتا ہے۔ درج ذیل آیت ہم نے بارہا پڑھی ہوگی مگر اب ذرا اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کیجئے:

﴿ مَایَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلا مُمْسِکَ لَهَا، وَمَایُمْسِکْ فَلامُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾

''اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لئے کھول دے، اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کردے اسے اللہ کے بعد پھر دوسرا کھولنے والا نہیں'' (2)۔

اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جب ہم فلاں مصیبت میں گھر گئے تھے، جب تمام

....

(2) فاطر 2

دروازوں پر دستک دے کر مایوس ہوگئے تھے، جب تمام دروازے بند ہوگئے تھے تو آخر وہ کون تھا جس نے ہمیں اس پریشانی سے نجات دلائی تھی؟۔وہ الفتاح سبحانہ وتعالیٰ تھا۔

آیت مذکورہ پر غور کریں، جب اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر اپنے کسی بندے کیلئے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے، کون ہے جو اس دروازے کو بند کرسکتا ہے؟۔اور جب وہ کوئی دروازہ بند کر دے تو کون ہے جو اسے کھول سکتا ہے؟۔اس معنی کو واضح کرنے کیلئے کئی واقعات ہمیں ملتے ہیں۔رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے ایک واقعہ پیش خدمت ہے:

غزوہ بدر حق و باطل کے درمیان پہلا معرکہ تھا جس میں رسول اکرم ﷺ نے 15 سال کی محنت کے بعد 313 صحابہ کرامؓ کو میدان بدر میں کھڑا کر دیا تھا۔ان کے پاس وسائل نہیں تھے، اسلحہ کی کمی تھی، سامانِ حرب کی قلت تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ عدو تین گنا بڑا تھا۔غور کیجئے کہ جب مشکلات ومصائب بندے پر ٹوٹ پڑیں اور وہ چاروں طرف سے پریشانی میں گھر جائے تو رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر اس کی مدد کرتا ہے۔میدان بدر میں اس سے ملتے جلتے حالات تھے۔

جس صبح کو حق و باطل کے درمیان معرکہ پیش ہونا تھا، اس رات کو رسول اکرم ﷺ نے کیسے گزارا تھا؟۔روایات میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ وہ رات اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر دعا میں گزاری تھی، رسول اکرم ﷺ انتہائی عاجزی سے رب کو پکار کر کہتے رہے:

''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ سچا کر دکھا''۔

آپ ﷺ دعا مناجات کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

''اے اللہ! (یہ 313 میری عمر بھر کی کمائی ہے) اگر یہ لوگ ہلاک ہوگئے تو پھر زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا''۔

آپ ﷺ یہ دعا اس عاجزی وانکساری سے ہاتھ بلند کر کے کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی

چادر آپ ﷺ کندھوں سے گرگئی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت صدیق اکبرؓ کو آپ ﷺ پر ترس آ گیا۔ آپؓ نے عرض کیا:

”اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ (ﷺ) اپنے حال پر رحم فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور سچا ہوگا“(3)۔

اور پھر دیکھئے کہ رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر کس طرح اپنے نبی ﷺ کی مدد کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

”ابوبکرؓ! خوش ہو جایئے، یہ جبریل امینؑ ہیں، اپنے گھوڑے کی لگام تھامے فرشتوں کے ایک ہزار لشکر کی قیادت کر رہے ہیں“۔

پھر چشم فلک نے دیکھا کہ کس طرح مکہ نے اپنے جگر گوشے اگل دیئے اور کس طرح مسلمانوں نے کفر کے اکابرین کو کاٹ کر رکھ دیا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کو کون نہیں جانتا۔ امام محترم اپنے وقت کے ممتاز علماء اور امام ابن قیمؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کے علاوہ کئی جید علماء کے استاد تھے۔ آپؒ کے بارے میں آتا ہے کہ جب آپؒ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، جب کوئی گتھی الجھ جاتی، جب کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تو عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنا گال مٹی پر رکھ دیتے اور دیر تک اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے، پھر دعا کرتے:

”اے اللہ! (یہ لوگ مجھے امام اور شیخ الاسلام کہتے ہیں حالانکہ) میں کچھ بھی نہیں ہوں، اے میرے رب! یہ مسئلہ درپیش ہے جسے تو ہی حل کر سکتا ہے“۔

کہتے ہیں:

”اللہ کی قسم! جب میں مٹی سے اپنا گال اٹھاتا تو اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کا حل میرے دل میں القا کر دیتا“۔

....

(3) دیکھئے: کتب سیر۔

ہم نے کہا الفتاح وہ ہے جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے۔ الفتاح وہ ہے جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے۔

* دوسرا مفہوم:

وہ جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ پہلا مفہوم یہ تھا کہ جب مصیبت آجائے اور بندہ اس میں گرفتار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ الفتاح بن کر اسے اس پریشانی سے نجات دلاتا ہے جبکہ دوسرے مفہوم کا مطلب یہ ہے کہ ابھی پریشانی نہیں آئی، مصیبت کا وقت نہیں ہوا، وہ رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر پیشگی اس سے نجات دلانے کا بندوبست کرتا ہے۔ درج ذیل آیت کو بھی ہم نے بارہا پڑھا اور سنا ہے، اس پہلو سے اس پر غور کریں:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ﴾

''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا'' (4)۔

غیب کی ساری کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ جانتا ہے کہ میرے بندے کے حق میں بہتر کیا ہے، اسی کو مدنظر رکھ کر وہ اپنے بندوں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے۔ آیت مذکورہ میں (عِنْدَهٗ) کا لفظ پہلے آیا ہے، اگر یہ بعد میں آتا، مثال کے طور پر اگر یوں آتا:

وَ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ عِنْدَهٗ یعنی (عِنْدَهٗ) کا لفظ آخر میں آتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ ''غیب کی کنجیاں اس کے پاس بھی ہیں اور دوسروں کے پاس بھی ہو سکتی ہیں'' لیکن (عِنْدَہ) کو پہلے لا کر اس حقیقت کی طرف نشاندہی کی گئی کہ غیب کی کنجیاں صرف اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ انسان سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے جب یہ سمجھنے لگتا ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو بھی ہو سکتا ہے۔

آنے والے خطرات سے آدمی ڈرتا ہے اور اس سے پیشگی محفوظ رہنے کیلئے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے

....

(4) الانعام 59

حالانکہ پیشگی حفاظت کا انتظام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہ اپنے کرم سے الفتاح بن کر اپنے بندوں کی بہتری کے فیصلے کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی کو مستقبل کے بارے میں کسی قسم کا خدشہ ہو اور وہ آنے والی ممکنہ مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہے تو اسے الفتاح سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی تعلیم ہمیں صلاۃ الاستخارہ میں بھی دی گئی ہے۔

* تیسرا مفہوم:

وہ جو اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ، وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾

"کہو ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ کردے گا، وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے" (5)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا

﴿ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ ﴾

"اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کردے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے" (6)۔

جب کسی پر ظلم کیا جائے، جب کسی کا حق مارا جائے اور اس پر بے جا الزام لگایا جائے تو کون ہے جو مظلوم کو اس کا حق دلواتا ہے؟۔ کون ہے جو حق کو حق ظاہر کرتا ہے اور باطل کو باطل، جو صادقین کا صدق اور کاذبین کا کذب واضح کرتا ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر بہتان باندھا گیا تھا، اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے سیدہؓ کے پاس کوئی

....

(5) سبا 26

(6) الاعراف 89

ثبوت نہیں تھا۔ واقعہ افک کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ خود اپنے بارے میں کہتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کون آپ ﷺ کے ساتھ جائے۔ غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ ﷺ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینہ کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ کیا اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لئے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت میں اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں، میرا ہودج اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودج اونٹ پر رکھ کر روانہ ہوگئے۔

جب میں ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر کار اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ اسی حالت میں مجھ کو نیند آگئی۔ صبح کے وقت صفوان بن معطلؓ اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہیں پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا:

اناللہ وانا الیہ راجعون، رسول اللہ ﷺ کی بیوی یہیں رہ گئیں۔

اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، لاکر اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ میں اونٹ پر سوار

ہوگئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دو پہر کے قریب ہم نے لشکر کو جالیا جبکہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی میرا پتہ نہ چلا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں''۔

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ مزید فرماتی ہیں:

''مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہوگئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اُس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی مگر مجھے کچھ پتہ نہیں تھا البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کہ ''کیسی ہیں یہ؟'' خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لئے میں مدینے سے باہر گئی اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اور لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ راستے میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا:

''غارت ہو مسطح''۔

میں نے کہا:

''اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے بدر میں حصہ لیا ہے''۔

(یہ وہی مسطح ہے جنہوں نے بہتان کو پورے مدینہ میں خوب اچھالا تھا اور یہاں ام المومنینؓ کس طرح ان کی غیر حاضری میں انہیں اچھے الفاظ میں یاد کر رہی ہیں)

انہوں نے کہا:

''بٹیا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟''۔

پھرانہوں نے ساراقصہ سنایا کہ افتراپرداز لوگ میرے متعلق کیاباتیں اڑارہے ہیں۔یہ داستان سن کرمیرا خون خشک ہوگیا،وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لئے آئی تھی۔سیدھے گھرگئی اوررات بھرروکرکاٹی“۔

پھر ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں سیدہؓ پر بہتان کی خبریں اڑتی رہیں یہاں تک ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دے کرمسلمانوں کومخاطب فرمایا:

”مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھےاذیت پہنچانے کی حد کردی۔بخدامیں نے نہ تواپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہےاورنہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔وہ تو کبھی میری غیرموجودگی میں میرے گھرآیا بھی نہیں“۔

اس پر مسجد نبوی میں ہنگامہ مچ گیا،قریب تھا کہ اوس اورخزرج مسجد میں ہی لڑپڑتے۔اس بہتان کی افواہیں کم وبیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔

ہماری ماں سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیقؓ اس واقعہ پر کہتی ہیں:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے، میں روتی رہی،میرے والدین انتہائی پریشانی اوررنج وغم میں مبتلا رہے۔آخرکارایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔اس پوری مدت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔میرے والد سیدنا ابوبکرؓ اور ماں ام رومانؓ نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے،اسلئے وہ دونوں بھی پاس آکر بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”عائشہؓ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔اگرتم بے گناہ ہوتو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہرفرمادے گااوراگرواقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہوتو اللہ سے توبہ کرواورمعافی مانگو،بندہ جب اپنے گناہ کامعترف ہوکرتوبہ کرتا ہےتو اللہ معاف کردیتا ہے“۔

ہم نے کہا کہ الفتاح وہ ہے جواپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے،الفتاح حق اور

باطل کو واضح کرتا ہے، جب بندے کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلیئے کوئی دلیل نہ ہو تو رب سبحانہ وتعالیٰ الفتاح بن کر اس کی بے گناہی ثابت کرتا ہے۔سیدہ عائشہؓ کے پاس اس وقت اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلیئے کچھ نہیں تھا، فرماتی ہیں:

''یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے، میں نے اپنے والد سے عرض کیا:

آپؓ رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیں''۔

انہوں نے فرمایا:

بیٹی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔

میں نے اپنی والدہ سے کہا:

آپؓ ہی کچھ کہیں، انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں، اس پر میں بولی:

اب سیدہؓ کی بے بسی کا عالم اور ساتھ ہی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سے امید دیکھئے۔

''آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے، اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ نہ مانیں گے اور اگر خوامخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی تو آپ لوگ مان لیں گے؟''۔

کہتی ہیں:

''اس وقت سیدنا یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا''۔

اندازہ کریں، سیدہ عائشہؓ جو عالمہ اور فقیہہ ہیں، اس قدر حالات کے دباؤ میں ہیں کہ انہیں حضرت یعقوبؑ کا نام یاد نہیں آیا، فرماتی ہیں:

''اس حالت میں میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو سیدنا یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ: فَصَبْرٌ جَمِيلٌ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔اس وقت

اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا"۔

اس وقت سیدہؓ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوسکتی تھی؟۔ وہ خود کہتی ہیں:

"اگر چہ یہ بات تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے مگر میرا گمان تھا کہ رسول اللہ ﷺ کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرمادے گا"۔

اندازہ کریں کہ سیدہؓ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کاش رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کوئی خواب دکھادے جس سے برأت ظاہر ہوجائے مگر جب بندہ الفتاح سے رجوع کرتا ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اسے وہ کچھ دیتا ہے جس کا اس نے گمان بھی نہ کیا ہوگا۔ مزید فرماتی ہیں:

"اتنے میں یکا یک رسول اللہ ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو رسول اللہ ﷺ بے حد خوش تھے۔ آپ ﷺ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی:

"مبارک ہو عائشہؓ !، اللہ نے تمہاری برأت کے لئے آیات نازل فرمادی ہیں"۔

پھر آپ ﷺ نے سورہ نور کی آیات 11 تا 21 کی تلاوت کیں:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ جَاؤُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ...... ﴾

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں......"۔

میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔

میں نے کہا:

''میں نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا بلکہ اللہ کا شکرادا کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی ہے'' (7)۔

جب مصیبت اور پریشانی کا طوفان بندۂ مومن کو چاروں طرف سے گھیر لے، جب وہ اس قدر بے بس ہو جائے کہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے تو رب سبحانہ وتعالیٰ ''الفتاح'' بن کر اس کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔

الفتاح کے تینوں معانی سمجھ میں آنے کے بعد چند اہم نکات سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ ''الفتاح'' سے ہمارا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہو جائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ الفتاح کے دروازے پر جب بندہ دستک دیتا ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اس کی فوری طور پر مدد نہیں کرتا بلکہ اس کے صبر وعزیمت کا امتحان لینے کے لئے فتح میں تاخیر کرتا ہے تا کہ معلوم ہو کہ وہ کب تک الفتاح کے دَر سے چمٹا رہے گا۔ وہ الفتاح ہے اس لئے ضرور فتح دے گا مگر آزمانے کے بعد آخری لمحے تک فتح کو مؤخر کرے گا۔ وہ اپنے بندے کو اپنے دروازۂ رحمت کے پاس دیر تک کھڑا دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک بزرگ نے کیا خوب کہا ہے:

''اس کے دروازۂ رحمت سے جڑے رہو، خواہ تمہیں اس سے دھتکار دیا جائے اور قبولیت سے مایوس نہ ہو، خواہ تمہیں خالی ہاتھ لوٹا دیا جائے۔ جب رحمت کا دروازہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے کھول دیا جائے تو تم طفیلی بن کر داخل ہو اور اس سے کہو:

میں مسکین ہوں مجھ پر صدقہ کیجئے، تو نے ہی تو کہا کہ صدقہ فقراء اور مساکین کو دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا دروازۂ رحمت وہ دَر ہے جس سے کوئی مایوس نہیں ہوتا اور یہاں سے جو اپنی نادانی اور بے صبری سے مراد پوری کئے بغیر واپس لوٹ گیا تو زندگی بھر دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہے گا۔

....

(7) دیکھئے: کتب سیر نیز تفاسیر، سورہ النور، آیات 11 تا 21۔

یہ بھی یادرہے کہ جس دروازے کو زور سے پیٹا جاتا ہے تو وہ ضرور کھلتا ہے۔ رحمت کے دروازے کو زور سے بھی پیٹنا ہے اور مسلسل دستک بھی دینی ہے، وہ ضرور کھلے گا۔ اس کی بھی کئی مثالیں سیرت پاک میں ملتی ہیں، چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

11 ویں سن نبوت کا زمانۂ حج ہے، پورا عرب منیٰ میں جمع ہے۔ آپ ﷺ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عرب قبائل کو دعوت دیتے ہیں۔ بنو ہذل، بنوشیبان اور بنوثعلبہ کے علاوہ تمام وفود کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ حج کا موسم ختم ہونے والا ہے مگر کہیں سے بھی کوئی امید افزا جواب نہیں ملتا۔ آپ ﷺ اپنی کوششیں تیز کر دیتے ہیں۔ مزید افراد سے انفرادی اور اجتماعی طور پر ملاقاتیں کرتے ہیں، انہیں اسلام کی حقانیت بتاتے ہیں، قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، آخرت میں جنت کی خوشخبری دیتے ہیں مگر کوئی ایمان نہیں لاتا۔ آخر کار حج کا موسم ختم ہو گیا، لوگ واپسی کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں، سامان باندھا جا رہا ہے، خیمے اکھاڑے جا رہے ہیں مگر اس کے باوجود رسول اکرم ﷺ اپنی جدو جہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم نے کہا الفتاح وہ ہے جو دروازہ کھولتا ہے، ضرور کھولتا ہے مگر ذرا دیر سے کھولتا ہے اور جب دیتا ہے تو توقع سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔ سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گزرتے ہیں تو کچھ نوجوانوں کو باہم گفتگو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ سیدھا ان کا رخ کرتے ہیں اور ان کے پاس جا پہنچتے ہیں۔ یہ 6 نوجوان تھے جو یثرب (مدینہ منورہ) سے حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ اپنا سامان باندھ کر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا:

آپ کون لوگ ہیں؟۔

انہوں نے کہا کہ ہم قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''یعنی یہود کے حلیف''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود کے ساتھ رہن سہن سے انہوں نے ضرور سن رکھا ہوگا کہ اس زمانے میں ایک نبی کی بعث ہونے والی ہے۔انہوں نے کہا''ہاں'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''پھر کیوں نہ آپ حضرات بیٹھیں، کچھ بات چیت ہوجائے''۔

وہ لوگ بیٹھ گئے۔آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی،قرآن کی آیات پڑھ کر سنائیں اور آخرت میں جنت کا شوق دلایا۔آپ ﷺ نے جب اپنی بات ختم کی تو وہ نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر ایک نے دوسرے کو بولا:

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی (ﷺ) ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے ہیں، دیکھو! کہیں یہود تم پر سبقت نہ لے جائیں''(8)۔

یہ یثرب کے عقلاء الرجال تھے چنانچہ فوراً اسلام قبول کرتے ہیں اور اس طرح مدینہ منورہ میں اسلام کا بیج بویا جاتا ہے۔

اس واقعہ میں جہاں بے شمار اسباق ہیں وہاں یہ سبق بھی اس میں پوشیدہ ہے کہ''الفتاح'' پر بھروسہ کیا گیا تو وہ فتح ونصرت اور کامیابی کے راستے کا وہاں سے انتظام کرے گا جہاں سے کسی کا وہم وگمان بھی نہیں جاتا۔کسے معلوم تھا کہ منیٰ کی گھاٹی میں اسلام قبول کرنے والے یہ نوجوان دراصل انصار کا ہراول دستہ بنیں گے اور پھر اسلام کیلئے ایک سرزمین میسر ہوگی جہاں اسلام کا نور چہار دانگ عالم میں پھیلے گا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی اس طرح کے اسباق ہیں۔سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنویں میں پھینکتے ہیں مگر یہی کنواں سیدنا یوسف علیہ السلام کے عروج کا نکتۂ آغاز ثابت ہوتا

....

(8) کتب سیر۔

ہے۔آپؑ کوجیل میں ڈالا جاتا ہے جہاں 9 سال تک وہ جرم بے گناہی کی سزا کاٹتے ہیں۔ بظاہر زمینی حقائق یہی بتاتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام زندگی بھر جیل میں ہی رہیں گے۔ مصر میں کون تھا جو آپؑ کوجیل سے نکال سکتا تھا۔ فتح ونصرت کا راستہ وہاں سے آیا جہاں کسی کا گمان نہیں جاتا تھا۔ بادشاہ کو خواب آیا جس کی تعبیر پورے مصر میں سوائے سیدنا یوسف علیہ السلام کے کسی کے پاس نہیں تھی۔

صلح حدیبیہ تاریخ اسلام کا وہ باب ہے جہاں اسلام کی فتح ونصرت اور لوگوں کا اسلام میں جوق در جوق داخل ہونے کا سبب ہے مگر صلح حدیبیہ جن حالات میں ہوا اگر ان حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی سخت شرائط کو تسلیم کر کے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس صلح کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً ﴾

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کھلی فتح عطا کر دی''(9)۔

صلح حدیبیہ کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کا ردعمل سب کے علم میں ہے۔ اس پر سیدنا عمرؓ نے جو سوالات کئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس صلح کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں:

''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ فتح ہے؟''۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ''ہاں۔'' ایک اور صحابی حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، ہاں یہی فتح ہے''۔

سیدنا جابر ابن عبداللہؓ، سیدنا براء بن عازبؓ اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

....

(9) الفتح 1

''لوگ فتح مکہ کو فتح کہتے ہیں حالانکہ ہم اصل فتح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں''۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ اس صلح کے چند سال بعد رسول اکرم ﷺ مکہ مکرمہ کو فتح کرتے ہیں اور بعد ازاں لوگ جوق در جوق دین حق میں داخل ہوتے ہیں:

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴾

''جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے''(10)۔

اس سے ایک اور سبق بھی ملتا ہے، وہ یہ کہ ''الفتاح'' جب فتح دیتا ہے تو وہ عام فتح نہیں بلکہ فتح مبین ہوتی ہے۔ الفتاح سبحانہ وتعالیٰ سے صدق دل کے ساتھ رجوع کیا جائے تو وہ وہاں سے دیتا ہے جہاں سے انسان کا گمان نہیں ہوتا اور اتنا دیتا ہے جس کی توقع تک نہیں کی جاتی۔ اس حوالے سے بے شمار مثالوں میں سے سیدہ ہاجر علیہا السلام کا واقعہ پیش خدمت ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے دودھ پیتے بچے سیدنا اسماعیل اور اہلیہ سیدہ ہاجر علیہا السلام کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑتے ہیں جہاں بظاہر زندہ رہنے کے اسباب ناپید ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب اپنی اہلیہ سیدہ ہاجر علیہا السلام کو بطن مکہ میں چھوڑ کر واپس پلٹتے ہیں تو سیدہ دیکھتی ہیں کہ آپؑ کچھ کہے سنے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں۔ سیدہؑ اپنے ساتھ کھانے پینے کا جو سامان لائی تھیں وہ چند دنوں کے بعد ختم ہو جائے گا، اس کے بعد اس وادی میں گزر بسر کیسے ہوگی؟ وہ آپؑ کو پکار کر کہتی ہیں:

''ابراہیمؑ! ہمیں یہاں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟''۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتے بلکہ ایک لمحہ کیلئے رکتے تک نہیں۔ سیدہؑ دوبارہ یہی سوال کرتی ہیں مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نہ صرف کوئی جواب دیتے ہیں بلکہ ان کی رفتار میں معمولی سا فرق تک نہیں آتا۔ سیدہ ہاجر علیہا السلام ان کے پیچھے دوڑتی ہیں اور تیسری مرتبہ وہی سوال کرتی ہیں مگر دوسری طرف سے جب

....

(10)النصر 1

کوئی جواب نہیں ملتا تو آپ علیہا السلام وہ بات کہتی ہیں جو آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہے:

آاَللّٰهُ اَمَرَکَ بِهٰذَا

''کیا اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟''۔

سیدنا ابرہیم علیہ السلام اثبات میں جواب دیتے ہیں تو سیدہؑ فرماتی ہیں:

اَذًا لَنْ یُّضَیِّعَنَا

''پھر وہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا''۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ بندہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کام کرے اور یہ سمجھ کر کرے کہ یہ میرے رب کا حکم ہے تو رب سبحانہ وتعالیٰ اسے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

سیدہ ہاجر علیہا السلام اپنے ننھے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ چند دن رہتی ہیں پھر کھانے پینے کا سامان ختم ہوجاتا ہے جو وہ اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ ننھے اسماعیل علیہ السلام کو پیاس ستاتی ہے، بچے کو پیاس سے بلکتا دیکھ کر سیدہؑ بے قابو ہوجاتی ہیں۔ وہ صفا کی پہاڑی پر چڑھ جاتی ہیں تاکہ دیکھ سکیں کہ کہیں کوئی انسان، کوئی چرند پرند نظر آرہا مگر وہاں کوئی نظر نہیں آتا، پھر وہ دوڑ لگاتی ہوئی مروہ کی پہاڑی پر جاتی ہیں، وہاں دیکھتی ہیں مگر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ مامتا کی ماری سیدہؑ اس طرح 7 چکر لگاتی ہیں حالانکہ پہلے چکر میں ہی یقین ہوگیا تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ سیدہ علیہا السلام کی یہ ادا رب سبحانہ وتعالیٰ کو پسند آتی ہے۔ وہ ان کے لئے، ان کے بچے کیلئے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے اس بے آب وگیاہ وادی میں ایک چشمہ جاری کردیتا ہے۔

اس وقت اگر سیدہؑ سے پوچھا جاتا:

''بی بی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''۔

وہ یقیناً کہتیں:

''پانی کے چند قطرے مل جائیں تو بچے کو پلا دوں''۔

سیدہؑ کی یقیناً یہی سب سے بڑی خواہش ہوتی مگر الفتاح سبحانہ وتعالیٰ جب دیتا ہے تو بے حد وحساب دیتا ہے۔ اگر سیدہؑ کو چند قطرے ہی مل جاتے تو وہ اس پر راضی ہو جاتیں مگر اس نے جب دیا تو ''چھپر پھاڑ کر دیا''۔ زمزم کا کنواں جو قیامت تک خشک نہیں ہوگا اور عمرہ کی ادائیگی کے وقت صفا و مروہ کے درمیان سعی ہمیں ایک ماں کی یاد دلاتے ہیں جس نے اللہ کے بھروسے پر یہاں قیام کیا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو سبق دیا کہ:

''اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا''۔

معلوم ہوا کہ الفتاح جب دیتا ہے تو بے حد وحساب دیتا ہے اور وہاں سے دیتا ہے جہاں سے گمان نہیں ہوتا۔ شرط یہ ہے کہ اس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے اور اس کے در سے چمٹا جائے۔

الفتاح جو اپنی قدرت سے مشکلات اور مصائب کی گرہوں کو کھولتا ہے، جو سختی اور پریشانی کے لمحات کو راحت اور سکون میں بدل دیتا ہے، جو غیب کے معاملات میں آسانیاں پیدا کرتا ہے اور جو اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، کیا اس سے اس امت کی ناگفتہ بہ حالت پوشیدہ ہے؟۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ مسلمان آج کس ذلت ورسوائی اور پستی میں ہیں؟ یقیناً اُس سے ہمارا حال پوشیدہ نہیں، الفتاح ضرور اس امت کو فتح دے گا، یقیناً جلد فتح دے گا، وہ ضرور اِس دین کو غالب کرے گا کیونکہ یہ دین غالب ہونے کیلئے آیا ہے۔ اس کیلئے شرط یہ ہے کہ امت اپنی حالت بدلنے کیلئے پہلے خود کوشش کرے، الفتاح سے تعلق جوڑ دے، اس سے رجوع کرے اور یقین کرے کہ وہ اسے کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

یہ امت غالب ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اپنی مدد ونصرت اس وقت تک نہیں بھیجتا جب تک انسانوں کا ایک معقول گروہ اپنی تمام تر صلاحیتیں، پوری کوششیں اور ساری توانائیاں اس دین کو غالب

کرنے پر نہیں لگا دیتا۔ ایک اور اہم بات کہ اللہ تعالی نے اس دین کو غالب کرنے کی ذمہ داری امت کے سپرد کی ہے۔ امت جب تک اپنی کوششوں کو انتہا تک نہیں لے جاتی، اللہ تعالی کی مدد نہیں آئے گی۔

حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ میں ہمارے لئے ایک اہم سبق ہے۔ حضرت مریم بتول علیہا السلام کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے رب سبحانہ وتعالی کا فرماتا ہے:

﴿ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ ﴾

''پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا''۔

علمائے تفسیر کا کہنا ہے کہ وہ کھجور کے درخت کا تنا تھا، پورا درخت نہیں تھا، اس حالت میں حضرت مریم علیہا السلام کی بے بسی دیکھئے:

﴿ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنتُ نَسْياً مَّنسِيّاً ﴾

''وہ کہنے لگی: کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا''۔

﴿ فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيّاً ﴾

''فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا: غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے''۔

﴿ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيّاً ﴾

''اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجور ٹپک پڑیں گے''۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی قدرت سے کھجور کے تنے سے درخت اگا دیا، ان کے نیچے چشمہ جاری کر دیا، درخت میں فوری طور پر کھجور پکا دیئے، اگر کھجور بھی گرا دیتا تو کیا ہوتا؟۔ اس نے کھجور نہیں گرائے بلکہ زچگی کے عالم میں بھی حضرت مریم علیہا السلام سے مطالبہ کیا کہ کھجور کے تنے کو ہلا۔ دس صحت مند آدمی بھی کھجور کے تنے کو نہیں ہلا سکتے۔

اس سے کیا سبق ملا؟۔

جو کام انسان کے بس سے باہر ہے وہ اللہ تعالی خود کرتا ہے۔

تنے کو کھجور کے درخت میں تبدیل کرنا انسان نہیں کرسکتا، اللہ تعالی نے کر دیا......

چشمہ انسان جاری نہیں کرسکتا، اللہ تعالی نے کر دیا......

درخت سے کھجور کا پھل انسان نہیں پکا سکتا، اللہ تعالی نے پکا دیا......

مگر اس کی سنت ہے کہ انسان جب تک اپنی کوششوں کو انتہائی حد تک نہیں پہنچا تا اس کی مدد نہیں آتی۔ اس عالم میں بھی حضرت مریم علیہا السلام سے مطالبہ کیا گیا کہ آپؑ اپنی کوششوں کو انتہائی حد تک پہنچائیں تا کہ اللہ تعالی مدد ونصرت آئے۔ اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ زچگی کے عالم میں حضرت مریم علیہا السلام کھجور کے تنے کو نہیں ہلا سکتیں، ان سے جو مطلوب تھا وہ کوشش تھی، انہوں نے اپنی کوشش کو انتہا درجے تک پہنچایا تب کھجور ان کے اوپر گرے۔

معلوم ہوا کہ الفتاح اس امت کو غالب کرے گا، ضرور غالب کرے گا مگر اس کی مدد ونصرت کا حصول امت کی کوشش کے بغیر نہیں آئے گا۔ امت اپنی کوشش کو انتہا حد تک لے جائے، پھر اللہ تعالی اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے اپنی مدد بھیجے گا۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دین کیلئے استعمال کرے۔ دین کو غالب کرنے کی کوشش میں لگا دے اور ہمارے کام میں اخلاص پیدا کرے۔

نوٹ:

یہ مواد تقریر کی صورت میں بھی دستیاب ہے۔

الرزاق، الرازق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ، مَآ أُرِيْدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَآ أُرِيْدُ أَن يُّطْعِمُوْنِ، إِنَّ اللّٰهَ هُوَالرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں، میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اللہ تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست''(1)۔

الرازق الرزاق دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں شامل ہیں اور دونوں تقریباً ہم معنیٰ ہیں۔ الرزاق کا مطلب ہے، سب کا روزی رساں اور الرازق کا مطلب ہے بہتر رزق دینے والا۔

رزق کے اصلی معنیٰ ہیں کسی کو کسی چیز سے نفع حاصل کرنے کی کھلی چھٹی دے دینا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت الرزاق ہے، وہ ذات باری تعالیٰ ہر جاندار کیلئے رزق پیدا کرنے اور رزق حاصل کرنے کیلئے اسباب مہیا کرنے والا ہے۔

رزق کی 2 قسمیں ہیں:

ظاھری رزق: جس میں غذا، پھل اور مشروبات وغیرہ آتے ہیں جنھیں کھانے سے جسم کو طاقت

....

(1) الذاریات 56 تا 58

وتوانائی مہیا ہوتی ہے اور انسان لذت وفرحت محسوس کرتا ہے۔

باطنی رزق :یعنی ایمان، جس سے ابدی زندگی یعنی آخرت کیلئے رہنمائی ملتی ہے، اس سے دین کا شعور اور دل کوسکون میسر آتا ہے۔ اس غذا کیلئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے اور رہنمائی کیلئے آسمان سے کتب نازل فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے دونوں رزق یعنی مال ودولت اور علم وفراست فراخ کر دیتا ہے، جس کیلئے چاہتا ہے دونوں رزق تنگ کر دیتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے دونوں میں سے ایک فراخ اور دوسرا تنگ کر دیتا ہے۔

زبان میں رزق کا مطلب تقسیم اور نصیب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم ''الرزاق'' قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے جبکہ ''الرازق'' قرآن مجید میں 5 مقامات پر ''خیر الرازقین'' کے صیغے میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے اسم کے طور پر الرازق نہیں آیا۔

الرزاق اور الرازق میں کیا فرق ہے؟

الرازق وہ ہے جو کبھی دیتا ہے، کبھی روکتا ہے، کبھی کسی کو دیتا ہے تو کبھی کسی اور کو روکتا ہے جبکہ الرزاق وہ ہے جو سب کو بلا انقطاع مسلسل دیتا ہے۔ اس کے عطا کا کوئی حد وحساب نہیں، وہ مومن کو بھی رزق دیتا ہے اور کافر کو بھی۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴾

''زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ

جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے“(2)۔

ایک اور مقام پر اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَكَأَيِّن مِن دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾

”کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“(3)۔

یہ بات مشاہدے میں ہے کہ بہت سے جانور اپنا رزق ذخیرہ نہیں کرتے۔ وہ روزانہ رزق کے حصول کیلئے نکلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں روزانہ رزق دیتا ہے۔ گزشتہ آیت میں إِلَّا عَلَى اللّٰه آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے رزق کی فراہمی اللہ تعالی نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔

سیدنا ابرہیم علیہ السلام نے کعبے کی دیواریں اٹھالیں تو یوں دعا کی:

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ﴾

”اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے“۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رزق کو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ جوڑ دیا تھا مگر رزق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، وہ کافر اور مسلم دونوں کو رزق دیتا ہے، اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فرمایا:

﴿ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلاً ﴾

....

(2)ہود 6

(3)العنکبوت 60

''اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا'' (4)۔

اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں تمام جانداروں کے رزق کا سامان فراہم کر دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ، وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاء لِّلسَّائِلِينَ ﴾

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! ان سے کہو، کیا تم اس اللہ سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا، وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے، اس نے زمین کو وجود میں لانے کے بعد اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کیلئے ہر ایک کی طلب وحاجت کے مطابق ٹھیک انداز ے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا، یہ سب کام چار دن میں ہو گئے'' (5)۔

ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا:

﴿ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَفْعَلُ مِن ذَلِكُم مِّن شَيْءٍ ﴾

''اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟'' (6)۔

یہاں رزق کے معاملے میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ رزق کا معاملہ تو بہت

....

(4) البقرہ 126

(5) حم سجدہ 9، 10

(6) الروم 40

پہلے طے کر دیا گیا ہے۔رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے ہر کوئی اپنی ماں کے پیٹ میں نطفے کی صورت میں 40 دن رہتا ہے، پھر وہ 40 دن لوتھڑا رہتا ہے، پھر 40 دن بوٹی رہتا ہے پھر اللہ کی طرف سے فرشتے کو بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کے متعلق 4 باتوں کا فیصلہ ہوتا ہے: اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور یہ کہ وہ شقی ہے یا سعید'' (7)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آنے والے ہر انسان کے رزق کا فیصلہ اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔اندازہ کیجئے جس رزق کے لئے ہم اپنے آپ کو ہلکان کئے بیٹھے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے چکر میں ہیں، وہ حقیقت میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا ہمارے لئے لکھ دیا گیا ہے نیز ہم میں سے کسی کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک ہم اپنے حصے کا لکھا ہوا رزق مکمل طور پر نہ حاصل کرلیں، رسول اکرم ﷺ کا فرمان ذی شان ہے:

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوَعِیْ اَنَّہٗ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَکْمَلَ رِزْقَھَا

''روح القدس نے مجھے الہام کیا کہ کسی متنفس کو موت نہیں آسکتی جب تک اس کا رزق اور عمر پورے نہ ہو جائیں'' (8)۔

دور جدید میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آسائش کے حصول میں ہم بھول گئے کہ رزق کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَمَّنْ هَذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ إِنْ أَمْسَکَ رِزْقَهُ بَل لَّجُّوا فِیْ عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴾

....

(7) حدیث صحیح: بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، بخاری 7454، مسلم 2643

(8) یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوامامہؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے۔علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے اس کے بارے میں کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے نیز یہ متعدد طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔دیکھئے: فقہ السیر ہ 91۔علامہ ابن اثیرؒ نے شرح مسند الشافعی میں اسے مشہور قرار دیا ہے۔دیکھئے: شرح مسند الشافعی 5/546۔

’’یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں‘‘(9)۔

ایک بزرگ سے پوچھا گیا:’’آپ کو کھانا پینا کون دیتا ہے‘‘۔

انہوں نے جواب دیا:

’’میں اللہ کے خزانوں سے کھاتا پیتا ہوں‘‘۔

آدمی نے غصے سے کہا:

’’کیا وہ آپ پر روٹی کی بارش کرتا ہے‘‘۔

بزرگ نے کہا:

’’یہ زمین اگر اس کی ملک نہ ہوتی تو وہ یقیناً آسمان سے روٹی کی بارش کرتا‘‘۔

اس بزرگ نے کتنی بڑی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔واقعی یہ زمین اگر اللہ تعالیٰ کی نہ ہوتی تو وہ آسمان سے ہم پر رزق برساتا مگر کیونکہ اس نے ہمارے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے اور یہ زمین بھی اسی کی ہے تو وہ ہمیں اتنا ہی رزق دیتا ہے جتنا ہمارے مقدر میں ہے۔

رزق صرف روزی نہیں بلکہ ہر عطا کی ہوئی چیز کا شمار رزق میں ہوتا ہے۔رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ

’’بندہ گناہ کے باعث رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے‘‘(10)۔

....

(9)الملک 21

(10)حدیث صحیح :بروایت حضرت ثوبانؓ،الجامع الصغیر،از امام سیوطیؒ 4262،شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے بھی مجموع الفتاوی میں اسے صحیح کہا ہے تاہم اسی طرح کی ایک حدیث ضعیف الجامع میں ہے جس کا ترجمہ ہے: دعا قضا کو لوٹاتی ہے اور نیکی رزق میں کشادگی کا باعث ہے اور بندہ گناہ کے باعث رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے‘‘۔اس حدیث کو علامہ البانیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔دیکھئے: ضعیف الجامع 3006۔

معلوم ہوا کہ گناہوں کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دی جاتی ہے اوراس سزا کی ایک صورت رزق کی تنگی بھی ہے۔اس کی تائید سورہ النساء کی آیت 123 سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

﴿ مَن يَعۡمَلۡ سُوٓءً ا يُجۡزَ بِهِۦ ﴾

''جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا'' (11)۔

معلوم ہوا کہ جو کوئی دنیا میں برائی کرے گا اس کی لازماً سزا اسی دنیا میں پہلے پائے گا جبکہ آخرت کی سزا اور بھی شدید ہے اور یہ سزا رزق کی تنگی کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اور کسی اور صورت میں بھی، اثر میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا:

''اے اللہ تو کتنا کریم ہے، میں تیری نافرمانی کرتا ہوں اور تو مجھے سزا نہیں دیتا''۔

اسے آواز آئی:

''میں تجھے برابر سزا دے رہا ہوں مگر تجھے اس کا شعور نہیں! کیا میں نے تم سے مناجات کی لذت نہیں چھینی''۔

گناہوں کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ کبھی کبھی انسان سے اطاعت کی لذت چھین لیتا ہے۔ پھر آدمی روح سے خالی بندگی کرتا تو ہے مگر اسے اُس کی اِس اطاعت کے وہ ثمرات حاصل نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں ہم جو گناہ کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ان پر ہمیں دنیا میں کوئی سزا نہیں ملے گی تو یہ ہمارا غلط تصور ہے، سلف صالحین میں سے کسی نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں اپنی اونٹنی کے رویہ کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہوں کہ اس کا یہ رویہ میرے گناہ کی وجہ سے ہے''۔

صحابہ کرامؓ کے آخری دور میں دنیا فتح ہوئی اور مفتوحہ ممالک کی مال و دولت سمٹ کر مسلمانوں کے قبضے میں آئی تو صحابہ کرامؓ نے اپنے دور کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

....

(11) النساء 123

''تم گناہ کرتے ہو اور وہ گناہ تمہاری نظر میں بال سے زیادہ باریک ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم ان گناہوں کو کبائر میں شمار کرتے تھے۔''

بزرگوں کا کہنا ہے کہ گناہوں کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ آدمی گناہ کو ہی بھول جائے۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ انسان کے دل سے گناہ کے قبح کا تصور ختم کردے''۔

یعنی آدمی گناہ کرے اور اس کو برا نہ سمجھے۔ اسے گناہ میں لذت میں محسوس ہونے لگے۔

بزرگوں کا کہنا ہے:

''اگر تم دیکھو کہ لوگ تمہیں سراہتے ہوئے اچھا سمجھ رہے ہیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے پردے کو دیکھ کر دھوکہ کھا رہے ہیں''۔

الرزاق اور الرازق وہ ہے جس نے اپنے تمام بندوں کا رزق مقرر کر رکھا ہے جس سے ذرا برابر کم ہوگا نہ زیادہ ملے گا مگر انسان ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کے حصول کے چکر میں رہتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادٍ مِنْ ذَهَب اَحَبَّ اَنْ لَهُ وَادِيًا آخَر، وَلَنْ يَمْلأَ فَاهُ اِلَّا التُّرَاب

''اگر ابن آدم کے پاس سونے کی وادی ہو تو وہ دوسری وادی کی خواہش کرے گا، آدمی کا منہ مٹی ہی بھر سکتی ہے'' (12)۔

یہ حقیقت اگر انسان کو معلوم ہو جائے تو اس کے ادراک سے اسے بندگی کا وہ مقام ملے گا جس کیلئے

....

(12) حدیث صحیح: بروایت حضرت انس بن مالک، صحیح مسلم 1048 جبکہ علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے السلسلة الصحیحة میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ اگر ابن آدم کے سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی بھی تمنا کرے گا۔ علامہ البانیؒ نے اسے متواتر کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ، مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ، إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴾

''میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں، میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اللہ تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست''(13)۔

بندگی کا احساس انسان میں یہ حقیقت پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، مجھے جو چیز مانگنی ہے اُسی سے مانگی چاہئے اور اس کائنات میں کوئی نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے جو دے سکتا ہو۔ اگر وہ رزق تنگ کرتا ہے تو اُس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے نیز جب وہ کسی چیز سے محروم کرتا ہے تو دراصل وہ کوئی بہتر متبادل کا انتظام کرتا ہے، اس حوالے سے ایک بڑھیا کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے:

ایک بڑھیا کسی ویرانے میں خیمہ گاڑ کر بیٹھتی ہے جہاں اپنے گزر بسر کیلئے خیمہ کے سامنے کی زمین پر ہل چلاتی ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے، گویا اس کے گزر بسر کا واحد ذریعہ یہی کھیتی ہے۔ جب کھیت لہلا اُٹھتی ہے تو ایک رات شدید آندھی، طوفان اور بارش ہوجاتی ہے۔ بادل رات بھر خوب برستے ہیں۔ وہ اپنے خیمے میں بارش اور آندھی سے چھپی بیٹھی رہتی ہے، آخرکار اسے نیند آجاتی ہے۔ جب دن چڑھتا ہے تو بڑھیا اپنا سر خیمے کے دروازے سے باہر نکال کر دیکھتی ہے کہ رات کی بارش اور آندھی نے کتنا نقصان کیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ اس کے گزر بسر کا واحد ذریعہ، اس کی کھیتی اجڑ چکی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا:

....

(13) الذاریات 56 تا 58

''اے اللہ! تو جو چاہے کر...... میرا رزق تیرے ذمے ہے''۔

آندھی بھیج، طوفان بھیج، بارش برسا اور میری کھیتی خراب کر، تیری مرضی۔ میں تو ایک بات جانتی ہوں کہ میرا رزق تیرے ذمہ ہے۔

اندازہ کیجئے کہ کس طرح اس بڑھیا کو یقین تھا کہ میرا رزق اس کھیتی میں نہیں بلکہ میرا رزاق موجود ہے، اگر کھیتی خراب ہوگئی تو میرا رزق بند نہیں ہوا، وہ رزاق کہیں نہ کہیں سے انتظام کردے گا۔

یہ بندگی کا وہ مقام ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پایا تھا۔

جب وہ مصر سے نکلے اور مدین پہنچے تو بھوک نے ستایا، ایک ادنیٰ سی چیز یعنی روٹی کا نوالہ بھی اللہ سے مانگا:

﴿ رَبِّ إِنِّیْ لِمَا أَنزَلْتَ إِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴾

''پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے میں اس کا محتاج ہوں''۔

اور جب طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو اس بلند ترین مقام کے حصول کا مطالبہ بھی اللہ تعالیٰ سے کیا جو اس دنیا میں ممکن نہیں تھا۔ آپؑ نے کہا:

﴿ قَالَ رَبِّ أَرِنِیْ أَنظُرْ إِلَیْکَ ﴾

''یارب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔

معلوم ہوا کہ الرزاق وہ ہے جس سے تمام چیزیں طلب کی جائیں خواہ وہ چیزیں ہماری نظر میں کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہوں۔ جب یہ یقین پیدا ہوجائے تو پھر اس سے اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ میرا پاس جو کچھ بھی ہے، وہ ختم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے:

﴿ مَا عِندَکُمْ یَنفَدُ وَمَا عِندَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾

''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہوجانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے

والا ہے“ (14)۔

انسان رزق کی سعی میں جب ایمان اور یقین سے عاری ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے رزق کا انتظام کرتا ہے بلکہ بچوں اور بچوں کے بچوں کی بھی بھی فکر کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالی کی رزاقیت پر یقین اور اس پر ایمان ہو تو اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے اور انہیں کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ سورہ الکھف میں ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ انسان کے ایمان اور یقین کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے مرنے کے بعد اس کے بچوں کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے۔ سیدنا خضر اور موسیٰ علیہم السلام کا جب ایک بستی سے گزر ہوتا ہے تو وہاں ایک دیوار ایسی ملتی ہے جو گرا چاہتی ہے۔ سیدنا خضر علیہ السلام اسے نئے سرے سے تعمیر کر کے سیدھا کر دیتے ہیں۔ بعد میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے استفسار پر وہ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

﴿ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا ﴾

”اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں، اس دیوار کے نیچے ان بچوں کا خزانہ مدفون ہے“ (15)۔

یہ یتیم اور ناتواں بچے ہیں، اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن ہے، اگر دیوار گر گئی تو انکا خزانہ ظاہر ہو جائے گا اور لوگ اسے لوٹ لیں گے جبکہ وہ یتیم اپنے خزانے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ بچے جوان ہوں تو اپنے خزانے کو نکال لیں جبکہ اس حالت میں وہ اس کی حفاظت کر سکتے ہوں۔ یہ سارا اہتمام ان یتیم بچوں کے لئے کیوں کیا گیا:

﴿ وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً ﴾

....

(14) النحل 96

(15) الکھف 82

''اوران کا باپ ایک نیک آدمی تھا'' (16)۔

معلوم ہوا کہ انسان کی نیکی اوراس کی صالحیت اس کے بچوں کوبھی کام آتی ہے۔

سورہ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو کتابِ ہدایت قرار دیا ان لوگوں کیلئے جو:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾

''غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' (17)۔

اور ہم طے کر کے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تمام چیزیں رزق ہیں، اس رزق سے خرچ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور یہ بجز اس کے ممکن نہیں کہ انسان کو یقین ہو کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِيْ إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِيْنَ ﴾

''جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب، کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا'' (18)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

....

(16) الکہف 82

(17) البقرہ 3

(18) المنافقون 10

يَـقُوْلُ الْعَبْدُ : مَالِيْ ، مَالِي ، اِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ ، مَا اَكَلَ فَاَفْنَىٰ ، اَوْ لَبِسَ فَابْلَىٰ ، اَوْ اَعْطَىٰ فَاَقْتَنَىٰ وَمَاسِوَىٰ ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهٗ لِلنَّاسِ

''بندہ کہتا ہے: میرا مال! میرا مال! حالانکہ اس کے مال میں سے تین چیزیں اس کی ہیں، جو اس نے کھا کے ختم کر دیا، یا پہن کے بوسیدہ کر دیا یا (صدقہ) دے کر (آخرت کا) توشہ بنا دیا اس کے سوا جو مال ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ کر (اس دنیا سے) چلا جائے گا''(19)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴾

''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے، جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے''(20)۔

ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ، سیدنا بلالؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ سیدنا بلالؓ، آپ ﷺ کے خازن بھی تھے۔ آپ ﷺ نے سیدنا بلالؓ کے پاس ایک پوٹلی میں کھجور دیکھی۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا تو سیدنا بلالؓ نے عرض کیا:

شَیْءٌ اِدَّخَرْتَهٗ لِغَدٍ

''تھوڑی سی کھجور ہے جسے میں نے کل کیلئے محفوظ کر رکھا ہے''۔

آپ ﷺ اس پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

اَمَا تَخْشَىٰ اَنْ تَرَىٰ لَهٗ بُخَارًا فِيْ نَارِ جَهَنَّمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، اِنْفِقْ بِلَال ! وَلَا تَخْشَىٰ مِنْ

....

(19) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، مسلم 2959، صحیح الجامع 8133

(20) الحدید 7

ذِیْ الْعَرْشِ اِقْلَالًا

''کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں کہ ذخیرہ کی ہوئی یہ کھجور قیامت کے دن جہنم کی آگ کا دھواں بن جائے، اے بلالؓ! اللہ کی راہ میں خرچ کر اور بچا بچا کر نہ رکھ، وہ عرش والا تمہیں دینے میں کمی نہیں کرے گا'' (21)۔

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنْفِقْ ، یُنْفِقِ اللّٰہُ عَلَیْکَ

''تو بندوں پر خرچ کر، اللہ خزانۂ غیب سے تجھے دیتا رہے گا'' (22)۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد تیز قدموں سے دولت کدے کی طرف تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور صحابہ کرامؓ کے چہروں پر حیرت واستعجاب کے آثار دیکھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذَکَرْتُ شَیْئًا مِنْ تَبْرٍ عِنْدَنَا، فَکَرِھْتُ اَنْ یُمْسِیْ عِنْدَنَا فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِہٖ

''مجھے یاد آیا کہ (صدقے سے بچا ہوا) سونے کا ایک ٹکڑا گھر میں رہ گیا ہے، مجھے برا لگا کہ یہ رات بھر ہمارے ہاں رہے، اس لئے میں نے اسے (غریبوں میں) تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے'' (23)۔

ہم کہتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں جو کچھ بوئے گا، آخرت میں وہی کچھ کاٹے گا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ

....

(21) دیکھئے: تخریج مشکوٰۃ المصابیح 1826، علامہ البانی نے اسے "صحیح بمجموع طرقه" کہا ہے جبکہ اس سے ملتی جلتی دیگر روایات مختلف کتب حدیث میں ہیں جن پر محدثین نے کلام کیا ہے۔

(22) حدیث ضعیف: بروایت حضرت قیس بن سلع انصاریؓ، دیکھئے: ضعیف الترغیب و الترھیب 542، جبکہ حدیث کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث مبارکہ میں بھی آئے ہیں جنہیں علامہ منذریؒ نے اپنی کتاب "الترغیب و الترھیب" میں نقل کیا ہے اور اسے صحیح یا حسن قرار دیا ہے۔

(23) حدیث صحیح: بروایت حضرت عقبہ بن حارثؓ، بخاری 1221، واضح رہے کہ متن میں "تَبْرٍ" استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب وہ خالص سونا جسے زیور میں ڈھالا نہ گیا ہو، ہیرے جواہرات کو زیور میں ڈھالنے سے پہلے بھی تبر کہتے ہیں۔ دیکھئے: لسان العرب

نے ہم سے اس مال سے خرچ کرنے کا مطالبہ کیا ہے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنا من پسند مال خرچ کرنے سے آخرت میں ہمیں من پسند انعام دیا جائے گا۔

ایک آدمی نے فقراء اور مساکین کیلئے بدترین قسم کی کھجوریں ایک جگہ پر لٹکا دیں تا کہ فقراء اور مساکین اس میں سے کھائیں۔ رسول اکرم ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا:

لَوْشَاءَ رَبَّ هٰذِهِ الصَّدَقَةِ تَصَدَّقَ بَاَطْيَبَ مِنْهَا، اِنَّ رَبَّ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ يَأْكُلُ حَشَفًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

''بدترین کھجوروں کا صدقہ کرنے والا اگر چاہتا تو اس سے بہتر صدقہ کر سکتا تھا، جس طرح اس نے بدترین کھجوروں کا صدقہ کیا ہے، قیامت کے دن اسے بھی کھانے کیلئے بدترین کھجوریں دی جائیں گی'' (24)۔

دراصل جب دنیا کی سب سے بڑی اور نمایاں علامت حب مال ہے۔ دنیا کی محبت دلوں سے نکالنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرے۔ اس سے اس کے دل میں یقین پختہ ہوگا کہ دراصل یہ مال اللہ تعالی کی امانت ہے اور وہی رزاق ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یقین پیدا کرنے کی توفیق عطا کرے کہ وہی رازق ہے اور وہی رزاق، آمین۔

....

(24) حدیث حسن: صحیح نسائی 2492، ابوداؤد 1608، ابن ماجہ 1486، صحیح الترغیب 879، علامہ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ واضح رہے کہ متن میں ''حشف'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ '' تمر حشف'' وہ کھجور ہے جو بدترین قسم کی ہو، حشف اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو خشک، بدذائقہ اور سوکھی ہو۔

الوکیل

سورہ آل عمران، آیات 172 تا 174 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّـذِیـنَ اسۡتَـجَابُواۡ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعۡدِ مَآ أَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ،لِلَّذِیۡنَ أَحۡسَنُواۡ مِنۡهُمۡ وَاتَّـقَـواۡ أَجۡرٌ عَظِیۡمٌ،اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُواۡ لَکُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ إِیـمَـانـاً وَّقَـالُـواۡ حَسۡبُـنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ،فَانۡقَلَبُواۡ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡهُمۡ سُوءٌ وَّاتَّبَعُواۡ رِضۡوَانَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴾

’’جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکو کار اور پرہیز گار ہیں ان کیلئے بڑا اجر ہے، اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے، آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرور بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوگیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے‘‘۔

یہ آیات مبارکات جنگ احد سے متعلق ہیں۔ جنگ احد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے آپس میں کہا کہ یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ مسلمانوں کی طاقت توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اسے کھو کر چلے آئے چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے آپس میں

مشورہ کیا کہ مدینہ منورہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کیا جائے لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور وہ مکہ مکرمہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی ﷺ کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر پلٹ کر نہ آئیں، اس لئے جنگ احد کے دوسرے دن ہی آپ ﷺ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہئے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جاں نثار کرنے لئے آمادہ ہو گئے اور نبی ﷺ کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ منورہ سے 8 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ آیات انہی فداکاروں کے حوالے سے نازل ہوئی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل

''ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب آپؑ کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا اور محمد ﷺ نے اس وقت کہا تھا جب لوگوں نے کہا کہ مکہ کے کافروں نے آپ ﷺ سے لڑنے کیلئے بڑا لشکر جمع کیا ہے، ان سے ڈرو، یہ خبر سن کر صحابہ کرامؓ کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل

''ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔

ہمارا موضوع انہی آیات کے متعلق ہے، ہم اللہ تعالیٰ کے نام ''الوکیل'' کے متعلق گفتگو کریں گے اور معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ الوکیل کے کیا معانی اور مفہوم ہمارے سامنے آتے ہیں نیز اللہ تعالیٰ پر توکل کا کیا مطلب ہے۔

الوکیل کا سیدھا اور آسان مطلب ہے:

کارساز، جس کے سپرد اپنے معاملات کئے جائیں، نگہبان، حوالہ دار اور مختار۔

وکیل کا لفظ عموماً ہمارے ہاں بولا جاتا ہے اور ہم سب کو اس کا مطلب بھی معلوم ہے۔ وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اسی معنی میں ہم اردو زبان میں وکیل کا لفظ اس شخص کیلئے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالے اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔

الوکیل کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ جس کے حوالے تمام کام کئے جائیں، وہ تمام مخلوق کا مالک ہے، تمام کام اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ ہر کسی کا کارساز ہے۔

وکیل کے ایک معنی محافظ اور مدبر کے بھی ہیں۔ ہر چیز اس کے سپرد ہے اور وہ کسی مشاورت یا شراکت کے بغیر ان کی حفاظت اور تدبیر کرتا ہے۔

الوکیل اللہ تعالیٰ کے اسماءُالحسنیٰ میں ایک نام ہے جو قرآن مجید میں مختلف تراکیب سے 14 مرتبہ آیا ہے۔ اردو زبان میں توکل کا مطلب سپردگی بھی ہے۔ ہم کہتے ہیں فلاں میرا وکیل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے تمام معاملات اس کے سپرد ہیں۔ توکل خود سپردگی کو بھی کہتے ہیں اور اعتماد کو بھی، آدمی جس پر توکل کرتا ہے، اس پر اعتماد بھی کرتا ہے۔ وکیل نیابت بھی کرتا ہے، میرا وکیل میری جگہ میری نیابت کرتے ہوئے میرے معاملات انجام دیتا ہے۔ وکیل کا ایک مطلب کفیل بھی ہے۔

الوکیل کا ایک عام مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کا وکیل ہے۔ ان کے رزق اور معاملات کے علاوہ ان کی حیات و موت اس کے ذمہ ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ ذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمْ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴾

''یہ ہے تمہارا رب، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا

وکیل ہے‘‘(1)۔

اس مفہوم کو قرآن مجید کے ایک اور مقام پر زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا:

﴿ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴾

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے‘‘(2)۔

الوکیل کا ایک خاص مفہوم ہے، وہ یہ ہے کہ جو اپنے اولیاء اور خاصان کا وکیل ہے، انہیں آسانیاں فراہم کرتا ہے اور مشکلات سے نجات دلاتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلاً ﴾

’’اللہ پر توکل کرو، وہی وکیل ہونے کیلئے کافی ہے‘‘(3)۔

اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کا وکیل بھی ہے اور اس کی معیت بھی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

توکل علی اللہ خاص دل کا معاملہ ہے جس کی ماہیت اور کیفیت کا کوئی پیمانہ نہیں، امام ابن قیمؒ کا کہنا ہے:

اَلتَّوَكُّلُ مِنْ عَمَلِ الْقَلْبِ

’’توکل دل کا معاملہ ہے‘‘۔

سیدنا ابن عباسؓ کا کہنا ہے:

’’توکل کا مطلب اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہے‘‘۔

توکل کا ایک مطلب ’’اللہ تعالیٰ پر حسن ظن ہے‘‘۔

توکل کی حقیقت یہ ہے کہ مخلوق پر سے توقع ختم ہو جائے۔

....

(1)الانعام 102

(2)الزمر 62

(3)الاحزاب 3

ایک بزرگ نے توکل کی حقیقت واضح کرتے ہوئے کہا:

قَطْعُ النَّظَرِ اِلَیٰ الْاَسْبَابِ بَعْدَ تَھْیِئَۃِ الْاَسْبَاب

''اسباب پرعمل کرنے کے بعد اسباب پر سے امید ختم ہوجائے''۔

یعنی کسی بھی کام کو کرنے کیلئے اس کے تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالی کے سپر کردینا اور اسباب سے امید ختم کردینا۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے توکل کی خوبصورت تشریح کی ہے، آپؒ سے پوچھا گیا:

مَتیٰ یَکُوْنُ الرَّجُلُ مُتوَکِّلاً

''آدمی اللہ پرتوکل کرنے والا کب مانا جائے گا''۔

انہوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''اِذَا رَضِیَ بِاللّٰہِ وَکِیْلاً''

''جب اللہ کو اپنا وکیل بنانے پر وہ مطمئن ہوجائے''۔

توکل کی حقیقت تک آدمی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک توحید کی حقیقت کو نہ پالے۔حافظ ابن قیمؒ کا جامع قول ہے:

''یہ دل کی کیفیت ہے جو ایمان باللہ کے باعث پیدا ہوتی ہے، دل میں جب یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ نفع ونقصان، عطا اور محرومی، رزق اور دیگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اس کی مشیت میں نہیں وہ کبھی نہیں ہوتا، یہ کیفیت جب دل میں پیدا ہوجائے تو توکل پیدا ہوتا ہے'' (4)۔

اسباب کو ترک کرنے کا نام توکل نہیں بلکہ اسباب اختیار کرنے کے بعد اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد

....

(4) مدارج السالکین، از علامہ حافظ ابن قیمؒ

کرنے کا نام توکل ہے۔علمائے کرام کا کہنا ہے:

''اسباب پر تکیہ کرنا کفر ہے جبکہ اسباب کو ترک کرنا بے وقوفی ہے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا:

يَا رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، اَعْقِلْهَا وَاَتَوَكَّلُ اَوْ اَطْلِقْهَا وَاَتَوَكَّلُ ؟

''اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں اپنی اونٹنی کو باندھوں اور اللہ پر توکل کروں یا اسے چھوڑ دوں اور توکل کروں؟''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَعْقِلْهَا وَتَوَكَّل

پہلے تم اسے باندھو پھر توکل کرو''(5)۔

انسانیت میں سب سے بڑے متوکل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے ایک نام المتوکل ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب اختیار کئے اور اللہ پر توکل کیا۔ہجرت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن غار میں رہے،ہجرت کیلئے رہبر کی خدمات اختیار کیں، بدر میں جو کچھ سامان حرب تھا وہ میدان میں لے آئے اور احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زرہ پہنی۔یہ اور اس طرح کے دیگر تمام امور حقیقتِ توکل کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان اسباب اختیار کرے اور نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

اس سلسلے میں ایک لطیف نکتہ پیش خدمت ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توکل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسراء ومعراج کیلئے حضرت جبریل امین علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے براق نامی سواری لے آئے تھے۔ اسی سواری پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے۔جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد اقصیٰ پہنچے

(5)حدیث حسن: بروایت حضرت انس بن مالکؓ، ترمذی 2517، علامہ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے تاہم یحیٰ القطان نے اسے منکر قرار دیا ہے جبکہ خود امام ترمذیؒ نے اس پر لکھا ہے ''حضرت انسؓ کی یہ حدیث غریب ہے جسے اس طریق کے علاوہ ہم نہیں جانتے''۔

اور انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت کیلئے مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے تو براق کوستون سے باندھ دیا حالانکہ یہ سواری خصوصی طور پر آپ ﷺ کے لئے ہی آئی تھی مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے اسے ستون سے باندھا۔

آپ ﷺ نے توکل کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے اس کی بلند ترین چوٹی کی نشاندہی کی:

لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَىٰ اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرِ ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا

''اگر تم اللہ پر توکل کرو، جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اسی طرح روزی دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح روزی کی تلاش میں گھونسلوں سے روانہ ہوتے ہیں تو ان کے پیٹ پچکے ہوئے ہوتے ہیں اور شام کو جب واپس آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں'' (6)۔

اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا ہے:

﴿ وَمَن يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهٗ مَخْرَجاً، وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ، وَمَن يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾

''جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اس کیلئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور ایسے راستے سے رزق دیگا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو، جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کیلئے وہ کافی ہے'' (7)۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، ہم اپنے آپ کو توکل کرنے والا سمجھتے ہیں، حضرت بشر حافیؒ کے اس فرمان پر غور کیجئے:

يَقُوْلُ اَحَدُهُمْ تَوَكَّلْتُ عَلَىٰ اللّٰه ، يَكْذِبُ عَلَىٰ اللّٰه ، لَوْ تَوَكَّلَ عَلَىٰ اللّٰه لَرَضِىَ بِمَا

---

(6) حدیث حسن صحیح: بروایت حضرت عمر بن خطابؓ، ترمذی 2344

(7) الطلاق 2،3

يَفْعَلُ اللّٰه

''آدمی کہتا ہے میں اللہ پر توکل کرتا ہوں، وہ اللہ پر جھوٹ بولتا ہے، اگر واقعی اس نے اللہ پر توکل کیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوتا''۔

اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تدبیر اور قضا پر راضی ہونا۔ اگر اس کی تدبیر اور قضا پر راضی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل ہی نہیں۔ توکل کا معیار کیا ہونا چاہئے؟۔ اس کی مثال اس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے جسے اپنی ماں کی چھاتی کے سوا دنیا کی کسی چیز سے کوئی غرض ہے نہ وہ اس دنیا میں سے کسی چیز سے واقف ہے۔ یہی **اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** کی حقیقت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ توکل کے درجات ہیں اور ہر آدمی اپنے ایمان کے مطابق اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ صحابہ کرامؓ بھی توکل میں درجات رکھتے تھے۔ اس کی مثال غزوہ تبوک کے موقع پر صحابہ کرامؓ کا انفاق ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کا سارا مال لے آئے اور بال بچوں کیلئے اللہ اور رسول ﷺ کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ آپؓ کے صدقے کی مقدار 4 ہزار درہم تھی۔ اس غزوے کیلئے سب سے پہلے آپؓ ہی نے صدقہ کیا اور رسول اکرم ﷺ نے آپؓ کا صدقہ قبول کیا۔ اسی طرح سیدنا عمرؓ نے اپنا آدھا مال خیرات کیا، آپ ﷺ نے آپؓ کا بھی صدقہ قبول فرمایا۔ اسی غزوہ میں حضرت عباسؓ بہت سا مال لے آئے۔ سیدنا طلحہؓ، سیدنا سعد بن عبادہؓ اور سیدنا محمد بن مسلمہؓ بھی کافی مال لے کر آئے، اسی طرح سیدنا عاصم بن عدیؓ 90 وسق (8) کھجور لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان سب کا صدقہ قبول فرمایا۔ سیدنا عثمان بن عفانؓ نے ملک شام کیلئے ایک قافلہ تیار کیا تھا جسے پالان اور کجاوے سمیت صدقہ کر دیا، اس کے بعد ایک ہزار دینار لے آئے اور انہیں نبی ﷺ کی آغوش میں بکھیر دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے پھر صدقہ کیا یہاں تک کہ ان کے صدقے کی مقدار نقدی کے علاوہ 9 سو

....

(8) ساڑھے 13 ٹن

اونٹ اور ایک سو گھوڑے تک جا پہنچی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بھی 200 اوقیہ چاندی صدقہ کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کیا۔

دوسری طرف سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک موقع پر اپنا پورا مال صدقہ کرنے کی پیشکش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا، انہوں نے اپنا آدھا مال صدقہ کرنے کی پیشکش کی تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا، انہوں نے اپنے ایک تہائی مال کو صدقہ کرنے کی پیشکش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا اور فرمایا:

''ایک تہائی قبول کرتے ہیں مگر ایک تہائی بھی زیادہ ہے'' (9)۔

صحیح معرفت کے بغیر توکل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت ہی توکل کی بنیاد ہے۔ اسباب اختیار کرنا اور اپنے طور پر تمام لوازم پر عمل کرنا نیز توحید میں راسخ ہونا توکل کی حقیقت ہے جبکہ توحید کے بغیر توکل ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ پر حسن ظن رکھنا بھی توکل کی بنیاد ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ پر حسن ظن ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہی میرے لئے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو خالق کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں:

﴿ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّانِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ﴾

''اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے گا جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں'' (10)۔

اسی لئے توکل کو دل سے جوڑا گیا کہ یہ خالص دل کا معاملہ ہے جسے ناپا نہیں جا سکتا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے:

....

(9) حدیث صحیح: بروایت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، بخاری 5668

(10) الفتح 6

اَلتَّوْحِيْدُ هُوَ قَوْلُ الْقَلْبِ، وَالتَّوَكُّل هُوَ عَمَلُ الْقَلْب

''توحید دل کا قول ہے جبکہ توکل دل کا عمل ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح کیا ہے کہ توکل صرف اللہ تعالیٰ پر ہی ہونا چاہئے کیونکہ جس پر توکل کیا جائے اس کے اندر کچھ صفات ہونی چاہئیں، وہ صفات درج ذیل آیات میں ہیں:

﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلاً ﴾

''وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں لہذا اسی کو وکیل بنالو'' (11)۔

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ﴾

''(اے محمد ﷺ) اس معبود پر توکل کرو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں'' (12)۔

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ، الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴾

''اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو'' (13)۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس پر توکل کیا جائے وہ مشرق ومغرب کا مالک ہو، وہ زندہ ہو، اس پر کبھی موت نہ آتی ہو، وہ ہمیں ہر وقت دیکھ رہا ہو۔ ان صفات سے عاری کسی بھی ہستی پر توکل نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ توکل دراصل ایمان کی علامت ہے:

﴿ وَعَلَى اللّهِ فَتَوَكَّلُواْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾

''اور اللہ پر توکل کرو، اگر تم مومن ہو'' (14)۔

....

(11) المزمل 9

(12) الفرقان 58

(13) الشعراء 217

(14) المائدہ 23

یہ ایمان کی علامت ہے اور اہل ایمان کا توکل صرف اللہ پر ہوتا ہے:

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا ﴾

''اللہ پر بھروسہ رکھو''۔

اس کا مطلب توکل صرف اللہ تعالیٰ پر ہی ہونا چاہئے، اگر یہ کہا گیا ہوتا کہ توکلوا علی اللہ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ توکل اللہ پر بھی ہوتا اور کسی اور پر بھی مگر فرمایا کہ اللہ پر ہی بھروسہ کرو کیونکہ بھروسہ صرف اللہ پر ہی ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد جو چیز معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ توکل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے بس میں جو کچھ ہے وہ کرے، تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ پر توکل کرے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت میں ہمارے لئے توکل کے بہترین نمونے ہیں۔ آپ ﷺ نے 15 سال محنت کی اور عمر بھر کی جمع پونجی میدان بدر میں پیش کر دی اور پھر اللہ پر توکل کیا۔ اس توکل کا کیا نتیجہ تھا:

﴿ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلاَثَةِ آلاَفٍ مِّنَ الْمَلآئِكَةِ مُنزَلِينَ ، بَلَى إِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَـذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلافٍ مِّنَ الْمَلآئِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴾

''یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ 3 ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے، بے شک اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اسی آن تمہارا رب (3 ہزار نہیں) 5 ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا'' (15)۔

میدانِ بدر میں قریش کے لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی، ایک ہزار افراد کو ہلاک کرنے کیلئے ایک فرشتہ

....

(15) آل عمران 124، 125

کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ پر توکل کا نتیجہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی مدد 5 ہزار فرشتوں سے کی۔

میدان احد میں جب مشرکین، مدینہ منورہ پر چڑھ دوڑے تو اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل

سیدنا ابراہیمؑ کو آگ میں جھونکا گیا تو جبریل امین علیہ السلام آئے اور فرمایا:

''اے ابراہیم، کیا تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟''

اس موقع پر جبکہ آپ علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا، آپؑ نے جواب دیا:

اَمَّا اِلَيْکَ فَلَا، اَمَّا اِلَى اللّٰهِ فَنَعَمْ ، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ کے مدد کی بہر حال ضرورت ہے، اللہ میرے لئے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔

اس توکل کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا:

﴿ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِىْ بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ ﴾

''اے آگ، ٹھنڈی ہو جا، سلامتی کے ساتھ ابراہیم پر'' (16)۔

اگر آگ کو صرف ٹھنڈا ہونے کا کہا جاتا ہے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ کی ٹھنڈک سے تکلیف ہوتی مگر آگ کو حکم ہوا کہ ٹھنڈک کے ساتھ سلامت والی بھی ہو جا۔

ایک اور لطیف نکتہ، حکم ہوا:

''اے آگ ٹھنڈی ہو جا سلامتی کے ساتھ ''ابراہیم'' پر''۔

اگر سیدنا ابراہیم کا نام نہ لیا جاتا ہے تو قیامت تک آگ ٹھنڈی رہتی۔

اسی توکل اور ایمان کا نتیجہ تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو انسانیت کا امام بنا دیا گیا۔

....

(16) الانبیاء 69

رسول اکرم ﷺ نے ہمیں اللہ پر توکل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:
''جو شخص:

حَسْبُنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْم

7 مرتبہ پڑھے گا تو اس دن اللہ تعالیٰ اس کے تمام معاملات سدھار دے گا اور جو شخص گھر سے نکلتے وقت:

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَىٰ اللّٰهِ ، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه

پڑھے گا تو فرشتہ اس سے کہتا ہے:
تمہیں ہدایت دی گئی ،تمہاری کفالت کی گئی اور تمہیں پناہ دی گئی۔
اس پر ایک شیطان دوسرے شیطان سے کہتا ہے:
اس شخص سے کیا لوگے جسے ہدایت دی گئی ،کفالت کی گئی اور وہ پناہ میں آ گیا'' (17)۔
رسول اکرم ﷺ نے اپنے چچازاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کس انداز سے تربیت کی ،فرمایا:
''اے لڑکے! میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں انہیں یاد رکھ،تو اللہ کو یاد رکھ، اللہ تجھے یاد رکھے گا،تو اللہ کو یاد رکھ اسے اپنے سامنے پائے گا، جب تجھے کوئی چیز مانگنی ہو تو اللہ سے مانگ اور جب تجھے مدد کی ضرورت ہو تو اللہ سے مدد مانگ، جان لو کہ تمام انسان تجھے کوئی نفع دینا چاہیں تو نہیں دے سکتے مگر وہ جو اللہ نے تیرے حق میں لکھ دیا ہے اور تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے اگر اللہ نے تیرے لئے نہ لکھا ہو'' (18)۔

(17) حدیث صحیح : براوایت حضرت انس بن مالکؓ،ابوداؤد 5095،ترمذی 3426
(18) محدثین نے اس پر کلام کیا ہے۔بعض طرق سے اس حدیث کو حسن کہا گیا ہے جبکہ بعض دیگر طرق سے اسے ضعیف سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو الوکیل بنانے اور اس کے فیصلوں پر راضی ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رب سبحانہ وتعالیٰ آپ سے وہ کام کراتا ہے جو دراصل آپ ہی کی بہتری کیلئے ہوتے ہیں۔ بندہ ایک کام کو اہمیت دے کر اس میں جت جاتا ہے، وہ اپنی کوشش سے اس کام کو بہتر سمجھ رہا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کیلئے کوئی اور ہی تدبیر کررہا ہوتا ہے۔اس کی مثال طائف کا سفر اور اس کے بعد پیش ہونے والے واقعات ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے جب دیکھا کہ مکہ مکرمہ میں حالات سازگار ہونے کے بجائے مزید خراب ہورہے ہیں تو آپ ﷺ دعوت کیلئے نئی سرزمین کی تلاش میں نکلتے ہیں۔آپ ﷺ کی نظرِ انتخاب طائف جاتی ہے جو مکہ مکرمہ سے قریب ہے۔آپ ﷺ طائف روانہ ہوتے ہیں اور وہاں 10 دن قیام فرماتے ہیں، اس دوران ایک ایک سردار کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور ہر خاص وعام کو دعوت ایمان دیتے ہیں لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ آپ ﷺ ہمارے شہر سے نکل جائیں۔آپ ﷺ نے واپسی کا قصد فرمایا تو طائف کے سرداروں نے اپنے اوباشوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگادیا۔وہ ہرزہ سرائی کرتے، تالیاں بجاتے اور شو مچاتے آپ ﷺ کے پیچھے لگ گئے۔ پھر اتنی بھیڑ لگ گئی کہ آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے، یہاں تک آپ ﷺ لہولہان ہوگئے۔آپ ﷺ کی ایڑی سے اس قدر خون بہا کہ آپ ﷺ کی جوتیاں پاؤں سے چپک گئیں۔آپ ﷺ نے طائف سے 3 میل دور ایک باغ میں پناہ لی اور وہاں آپ ﷺ نے وہ دعا فرمائی جسے دعائے مستضعفین کہا جاتا ہے۔اس دعا کے الفاظ سے آپ ﷺ کے غم وحزن اور رنج وافسوس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَیٰ النَّاس

''بارالہا! میں تجھ سے اپنی کمزوری، بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی نا قدری کا شکوہ کرتا ہوں......''۔

اسی باغ میں آپ ﷺ کی ملاقات عداس نامی عراقی نوجوان سے ہوئی جو دینِ نصاریٰ پر تھا۔

آپ ﷺ نے عداس کو ایمان کی دعوت دی اور اس نے اس پر لبیک کہا۔

اسی سفر سے واپسی کے وقت آپ ﷺ کی ملاقات جنوں کے وفد سے ہوئی جن کا ذکر سورہ احقاف میں ملتا ہے، جنوں کی یہ جماعت ایمان لے آئی تھی۔

سفر طائف سے واپسی کے بعد آپ ﷺ کو سفرِ اسراء و معراج کرایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کروائی۔

جو واقعات اوپر ذکر کئے گئے ان کی ترتیب اس طرح ہے:

1۔ طائف کا سفر

2۔ عداس کا ایمان لانا

3۔ جنوں کے وفد سے ملاقات

4۔ سفر اسراء و معراج

اللہ تعالیٰ الوکیل ہے اور وہ اپنے بندے کے معاملات کو بہتر طریقہ سے انجام دیتا ہے، ان واقعات کا تجزیہ دیکھئے:

1۔ اللہ کے رسول ﷺ طائف میں دعوت کیلئے نئی سرزمین تلاش کرنے گئے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت مدینہ منورہ تھی۔

2۔ آپ ﷺ اہل طائف کو اسلام کا پیغام پہنچانے گئے مگر اللہ تعالیٰ عراقی غلام کو یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔

3۔ رسول اکرم ﷺ انسانوں کو پیغام پہنچانے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ جنوں کو پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔

4۔ رسول اکرم ﷺ اہل زمین سے ملنے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اہل آسمان سے ملوانا چاہتا تھا۔

قارئین کرام!

آپ نے دیکھا...... ''الوکیل'' کس طرح اپنے بندے کے معاملات کو انجام دیتا ہے۔

گویا رسول اکرم ﷺ کی دعا کا جواب تھا...... آپ ﷺ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''بارالہا! میں تجھ سے اپنی کمزوری، بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں......''۔

گویا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو آسمانوں کی سیر کراتے ہوئے یہ پیغام دیا:

''اگر اہل زمین کے نزدیک آپ (ﷺ) کی قدر نہیں تو اہل آسمان کے ہاں آپ (ﷺ) کی بڑی قدر و منزلت ہے''۔

الوکیل کس طرح اپنے بندوں کے معاملات کو انجام دیتا ہے، اس کی ایک اور مثال دیکھئے:

حضرت حماد بن مسلمؒ بہت بڑے بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، آپؒ کا گزر ایک بوڑھی عورت کے گھر سے ہوا تو اندر سے اس کی آواز آئی:

''اے لطیف! ہم پر لطف و کرم کا معاملہ کر''۔

یہ آواز سن کر آپؒ رک گئے اور بارش تھم جانے کا انتظار کیا۔ جب بارش تھم گئی تو آپؒ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، 10 دینار نکلے، آپؒ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بچی نے دروازہ کھولا تو حضرت حماد بن مسلمؒ نے وہ 10 دینار دیتے ہوئے کہا:

''یہ لو، اسے اپنے کام میں لاؤ''۔

بیٹی نے یہ سن کر ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اماں، تو نے آواز اونچی کر کے حماد بن مسلم کو ہمارے اور رب کے درمیان لی آئی ہے''۔

بوڑھی عورت نے کہا:

''میں نے آواز اونچی نہیں کی تھی بلکہ الوکیل اسے لے آیا ہے''۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مجھے چند امتوں کا مشاہدہ کرایا گیا، میں نے دیکھا کہ قیامت کے دن ایک نبی کا اپنی امت کے ساتھ گزر ہوا، پھر دیکھا ایک نبی کی امت چند افراد تھے جوان پر ایمان لائے، پھر دیکھا ایک نبی گزرے جن کے ساتھ 10 افراد ان کے امتی تھے، پھر دیکھا ایک نبی کا گزر ہوا جن پر 5 افراد ایمان لے آئے، وہی ان کے امتی تھے، پھر دیکھا کہ ایک نبی کا گزر ہوا اور انکے ساتھ کوئی نہیں تھا، یعنی ان پر کوئی ایمان نہیں لایا۔ پھر دیکھا کہ انسانوں کا انبوہ نظر آیا، میں نے کہا: اے جبریل! یہ میری امت ہے؟۔انہوں نے کہا نہیں مگر وہاں افق کی طرف دیکھیں، وہ آپ (ﷺ) کی امت ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ سواد عظیم ہے جو میری طرف آ رہا ہے۔ جبریل نے کہا: یہ آپ (ﷺ) کی امت ہے اور ان میں 70 ہزار امتی ایسے ہیں جنہیں بغیر حساب کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔ میں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا:

كَانُوْا لَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَسْتَرِقُونَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْن

''وہ داغتے نہیں تھے، جھاڑ پھونک کرتے نہیں تھے، فال نہیں لیتے تھے اور وہ اللہ پر توکل کرتے تھے'' (19)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حسن توکل عطا کرے۔

....

(19) حدیث صحیح : براوایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، صحیح الادب المفرد 700

الحکیم

سورہ الانعام کی آیت 18 میں ارشاد ربانی ہے:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ، وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ

''وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور دانا و باخبر ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا مبارک نام ''**الحکیم**'' قرآن مجید میں کم و بیش ایک سو مرتبہ آیا ہے۔ یہ مبارک نام عموماً دوسرے ناموں کے ساتھ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے، مثال کے طور پر العلیم الحکیم قرآن مجید میں 37 مرتبہ، العزیز الحکیم 46 مرتبہ اور الحکیم الخبیر کے علاوہ دیگر مبارک ناموں کے ساتھ بھی مذکور ہے(1)۔

سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ''الحکیم'' کا مطلب کیا ہے؟۔

''الحکیم'' بہت ہی دانا و بینا کو کہتے ہیں، مقتضائے دانش کے مطابق کام اور فیصلہ کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کو سب سے بہتر انداز میں سمجھنے والا ہے، وہ دانا اور حکمت والا ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اُس کے تمام افعال اپنی مخلوق کی بھلائی اور آسانی کیلئے ہوتے ہیں۔ انسان اپنے افعال کے بارے میں جلد پریشان ہو کر مایوس ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات بے مثال ہیں جن کی پوری معرفت اس کے سوا کسی کو نہیں، اس کے ہر فعل میں

....

(1) دیکھئے: قرآن سرچ انجن ''المصحف الرقمی''

حکمت ہوتی ہے(2)۔

''الحکیم'' وہ ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے جسے اپنی مخلوق کے مصالح اور ان کے ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم ہے اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کیلئے بہترین تدابیر اختیار کرتی ہے۔ جو فیصلہ بھی وہ کرتا ہے، سراسر حکمت کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی کو دیتا ہے تو اسلئے دیتا ہے کہ حکمت اس کی مقتضا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو اس لئے نہیں دیتا کہ اسے دینا حکمت کے خلاف ہے۔

وہ حکیم ہے، جو کچھ کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کرسکتا۔

''الحکیم'' وہ ہے جس کا ہر قول اور ہر فعل صواب اور صحیح ہے۔ اُس کی حکمت کے کرشمے زمین و آسمان اور اس کی مخلوق میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللہ ہمارا آقا اور ہمارے معاملات کا متولی ہے۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ہماری بھلائی کس چیز میں ہے اور جو احکام بھی اس نے دیئے ہیں سراسر حکمت کی بنا پر دیئے ہیں۔

اس سے ایک اور نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہم خود مختار نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ ہمارا آقا ہے اس لئے اس کے مقرر کئے ہوئے طریقوں میں ردوبدل کرنے کا اختیار ہمیں نہیں۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے معاملات اُس کے حوالے کر کے بس اس کی اطاعت کرتے رہیں۔

قرآن مجید میں لفظ حکمت 6 معانی میں استعمال ہوا ہے:

اول۔ موعظت و نصیحت:

ارشاد ربانی ہے:

﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾

....

(2)الاسماءُالحسنٰی، از محمد ایوب سپرا

''ایسی حکمت جونصیحت کے مقصد کو بہ درجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں''(2)۔
یعنی ایسی حکمت جو موعظت اور نصیحت پر مشتمل ہے۔

دوم ۔سنتِ مطہرہ:

ارشادالٰہی ہے:

﴿ كَمَآ أَرۡسَلۡنَا فِيكُمۡ رَسُولاً مِّنكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتَابَ وَالۡحِكۡمَةَ ﴾

''میں نے تمہارے درمیان خود تمہی سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں میری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت (یعنی سنتِ مطہرہ) کی تعلیم دیتا ہے''(4)۔

امام شافعیؒ کا کہنا ہے:

''قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کا ذکر ہوا تو اس سے مراد سنت ہی ہے''۔

سوم ۔فہم وفراست:

قرآن مجید میں حکمت کا ایک مفہوم فہم وفراست ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَقَدۡ آتَيۡنَا لُقۡمَانَ الۡحِكۡمَةَ ﴾

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی''(5)۔

یعنی فہم وفراست عطا کی۔

چہارم ۔حکمت بمعنی نبوت بھی ہے:

....

(3)القمر 5

(4)البقرہ 151

(5)لقمان 12

﴿ وَ آتَیْنَاہُ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ الْخِطَاب ﴾

''ہم نے اسے (سلیمان کو) حکمت (یعنی نبوت) اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی'' (6)۔

پنجم۔قرآن مجید میں امر اور نہی:

﴿ ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ ﴾

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت کے ساتھ'' (7)۔

یعنی قرآن مجید میں امر و نہی کے مطابق دعوت دو۔

اس آیت کریمہ کی شرح میں علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو قرآن مجید کے متقضائے امر و نہی کے مطابق'' (8)۔

ششم۔حکمت قرآن مجید کے علم اور فہم کو بھی کہتے ہیں:

﴿ یُؤتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَاءُ ﴾

''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے'' (9)۔

یعنی قرآن کا فہم اور اس کا علم۔

قرآن مجید میں لفظ ''حکمت'' کے یہ 6 معانی اور مفہوم تھے۔اب دیکھئے قرآن مجید میں لفظ ''الحکیم'' کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ''الحکیم'' 4 معانی میں استعمال ہوا ہے:

....

(6) ص 20

(7) النحل 125

(8) بصائر ذوی التمیز، از علامہ فیروز آبادی۔

(9) البقرہ 269

اول۔وہ معاملات جن کا حکمت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے:

﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴾

''وہ رات جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے''(10)۔

دوم۔لوحِ محفوظ:

﴿ وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴾

''اور وہ ام الکتاب میں ثبت ہے، ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز ہے''(11)۔

سوم۔حکمت ودانش کا خزانہ:

﴿ الٓر، تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ﴾

''الر، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت ودانش سے لبریز ہے''(12)۔

چہارم۔قرآن حکیم:

﴿ يٰسٓ، وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ﴾

''یٰسین، قسم ہے قرآن حکیم کی''(13)۔

اللہ تعالیٰ اپنی حکمت میں با کمال ہے۔یہ حکمت تمام مخلوقات کے امور میں شامل ہے۔وہ چونکہ اول وآخر ہے اس لئے وہ اپنے وسیع تر علم کی بدولت ہر مخلوق کے امور کو کمال حکمت سے سرانجام دیتا ہے۔

حکمت کی 2 قسمیں ہیں:

....

(10) الدخان 4

(11) الزخرف 4

(12) یونس 1

(13) یاسین 1، 2

* پہلی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور پھر ان کیلئے زندگی گزارنے کا احسن نظام بنایا۔ان کی ضروریات پوری کرنے کیلئے وہ تمام سہولتیں فراہم کیں جن کی انہیں ضرورت تھی۔ کسی مخلوق کو بے سہارا نہیں چھوڑا اور نہ کوئی مخلوق بے مقصد پیدا کی۔ ہر مخلوق کوئی نہ کوئی اہم فریضہ سرانجام دیتی ہے جس کا ادراک عام لوگوں کو نہیں۔ پوری کائنات کو ایک ایسی مکمل حکمت کے تحت بنایا جس کو صرف وہی جانتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقاً مَّا تَرَی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَی مِن فُطُورٍ ، ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِأً وَهُوَ حَسِيْرٌ ﴾

''جس نے ساتوں آسمانوں کو اوپر تلے پیدا کیا، (تو اے دیکھنے والے) تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے، پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی'' (14)۔

''الحکیم'' وہ ہے جس نے اپنی مخلوقات کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، ایسی بہترین ساخت کہ اس سے بہتر کا تصور ممکن نہیں:

﴿ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِیْ أَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ﴾

''یہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا'' (15)۔

یہی مفہوم ایک اور مقام پر اس طرح ہے:

﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْراً ﴾

''اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر کی۔'' (16)۔

....

(14) الملک 3،4

(15) النمل 88 (16) الفرقان 2

* دوسری حکمت یہ ہے کہ اس نے انسانوں کی رہنمائی کیلئے رسل اور انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے اور کتب نازل کیں جو لوگوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ انبیاء ان کو عبادات اور اخلاقیات کا سبق پڑھاتے رہے اور اخروی دنیا میں کامیابی کیلئے رشد و ہدایت کے طریقے بتاتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ کام امت کے سپرد کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ حکمت کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیتے رہیں۔

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان لانے والے اور کفر کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُم وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴾

''کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے، بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں'' (17)۔

کیونکہ وہ خود ''الحکیم'' ہے اس لئے اپنے نیک بندوں کو حکمت عطا کر کے دنیا و آخرت کی بھلائی دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً ﴾

''جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی'' (18)۔

حضرت ابن عباسؓ کا کہنا ہے کہ حکمت سے مراد قرآن کا فہم ہے۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کو حکمت قرار دیا ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾

....

(17) الجاثیہ 21

(18) البقرہ 269

''یادرکھواللہ کی آیات اور حکمت کی باتوں کو جوتمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں''(19)۔

امام قرطبیؒ کا کہنا ہے:

''حکیم کواس لئے حکیم کہا جاتا ہے کہ کیونکہ وہ خود برائیوں سے بچا ہوا ہےاور لوگوں کو بھی اس سے روکتا ہے''(20)۔

حکمت سے مرادِ حق تک رسائی اور قول وعمل میں عدل ہے،اس کی تلاش میں نکلنے کاحکم دیا گیا ہے اس لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا:

''حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے،اسے جہاں سے ملے وہ اسے حاصل کرے''(21)۔

حکمت کا مطلب احاطہ کرنا اور روکنا ہے۔حکیم حاکم کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔علامہ اشرف علی تھانویؒ کہتے ہیں:

''حکمت کا مطلب حق اور خیرکواس کی ذات کیلئے پہنچاننا اوراس پرعمل کرنا ہے''۔

حکمت وہ ہے جس کے حق ہونے کی عقل گواہی دے۔

حکمت کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کے اندر منہجیت پیدا ہوتی ہے، وہ وسطیت اور اعتدال میں رہتاہے،اس کے اندر نرمی ہوتی ہے۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کہا کرتے تھے:

''نرمی حکمت کا سر ہے۔''

اسی طرح اس کے اندر خشیت پیدا ہوتی ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کہنا ہے:

''اگرتم دیکھو کہ کوئی آدمی خاموش طبع ہے اور لوگوں کی بھیڑ سے بھاگتا ہے تو اس کے پاس جاؤ

....

(19)الاحزاب 34

(20)الاسنی

(21)مختلف کتب میں اس حدیث کوایک راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

کیونکہ وہ حکمت اگلتا ہے''۔

ہر انسان کے دماغ میں حکمت ودانائی رکھی گئی ہے جو ایک فرشتے کے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ شخص تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے تو اس فرشتے سے کہا جاتا ہے کہ اس شخص کی حکمت کو اٹھاؤ (یعنی اسے حکمت ودانائی دیدو) اور جب یہ شخص (تواضع کے بجائے) تکبر کرتا ہے تو اس فرشتے سے کہا جاتا ہے کہ اس کی حکمت نیچے رکھ دو''(22)۔

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہوکر بھرا کرتی ہے پیمانے

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کمالِ حکمت ہے۔ ہم چونکہ ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں اس لئے ہمیں اس کام کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے بندوں کی بہتری چاہتا ہے اور وہ اسباب پیدا کرتا ہے جس سے بظاہر ہمارا نقصان نظر آتا ہے مگر حقیقت میں اس میں ہماری ہی بہتری ہے۔ اس کی بہترین مثال قرآن مجید میں مذکور قصہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہم السلام ہے۔ یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سورۃ الکہف میں مذکور ہے جس کے چند اسباق ذیل میں ہیں:

اس قصے کا پہلا اور بنیادی کردار حضرت خضر علیہ السلام ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور جن کے ظاہر میں مصیبت، تنگی اور پریشانی ہے مگر حقیقت میں وہ اللہ کی رحمت ہیں۔

قصے کا دوسرا کردار حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جن کو ایک عام انسان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور جن سے تقدیر کی حکمتیں پوشیدہ ہیں اور ہر کام میں فوری طور پر اپنی عقل سے توجیہ اور اس کی حکمت تلاش کرتے ہیں۔

....

(22) فیض القدیر، الجامع الصغیر

واقعات کا آغاز یوں ہوتا ہے:

﴿ فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ﴾

''یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف ڈال دیا''۔

کشتی میں سوراخ بظاہر مال کا نقصان اور کشتی کے مالکوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام فوری طور پر معترض ہوتے ہیں:

﴿ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ﴾

''آپ نے اس میں شگاف ڈال دیا تا کہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟''۔

ان کشتی والوں نے ہمارے ساتھ احسان کیا، ہمیں اپنی کشتی میں سوار کیا اور ہمیں اپنی منزل تک لے جا رہے ہیں، ان کے احسانات کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی کشتی میں ہی سوراخ کیا جائے؟۔

تقدیر اپنے اعمال کی توجیہ پیش نہیں کرتی۔ دونوں آگے بڑھتے ہیں:

﴿ حَتَّى إِذَا لَقِيَا غُلاماً فَقَتَلَهُ ﴾

''یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر ڈالا''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بے گناہ کے قتل پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے، فوراً معترض ہوئے:

﴿ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْساً زَكِيَّةً ﴾

''آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی''۔

تقدیر پھر اپنے اعمال کی توجیہ پیش نہیں کرتی، دونوں آگے بڑھتے ہیں، ایک ایسی بستی میں جاتے ہیں جہاں کے لوگ مہمانوں کو ان کا حق نہیں دیتے کہ مہمان کا حق ہے کہ اس کی مہمان نوازی کی جائے۔ دونوں خالی پیٹ بستی سے باہر نکل رہے ہوتے ہیں کہ ان کا گزر ایک باغ کی دیوار سے ہوتا ہے جو بوسیدہ ہو کر گرنے والی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کچھ کہے سنے بغیر فوراً آستین چڑھاتے ہیں اور

اس گرنے والی دیوار کو سیدھا کر دیتے ہیں:

﴿ فَوَجَدَا فِيهَا جِدَاراً يُرِيدُ أَنْ يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ﴾

''وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس فیاضی پر حیرت ہوئی، آپؑ تیسری مرتبہ احتجاج کرتے ہوئے لقمہ دیتے ہیں:

﴿ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْراً ﴾

''اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے''۔

مطلب یہ ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے حق مہمان نوازی ادا نہیں کی، بدلے میں آپ نے ان کی دیوار سیدھی کر لی، اگر آپ چاہتے تو اس خدمت کے بدلے میں کوئی اجرت، کوئی کھانا پینا مانگ لیتے۔

تیسری مرتبہ لقمہ دینے کے بعد اب تقدیر اپنے اعمال کی توجیہ پیش کرتے ہوئے بظاہر مصیبت کے پیچھے چھپی ہوئی حکمت واضح کرتی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْباً ﴾

''اُس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کروں کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ ہے جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا ہے''۔

کشتی میں سوراخ کرنا بظاہر شر اور مصیبت ہے، وقتی طور پر یہ نقصان ناقابل برداشت لگتا ہے مگر اس کے پیچھے مصلحت کو انسان کی آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے کیونکہ کچھ دیر بعد یہ کشتی ایک ایسے بادشاہ کے علاقے میں جانے والی تھی جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا ہے۔ یہ کشتی غریبوں کی ہے جو اس پر محنت مزدوری کر کے اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ بادشاہ نے اگر ان کی کشتی چھین لی تو ان غریبوں کے معاش کا

مسئلہ پیدا ہوگا، اگر اس میں سوراخ کرلیا گیا تو یہ کشتی وقتی طور پر تو عیب دار نظر آئے گی مگر بادشاہ کی دسترس سے بچ جائے گی۔ معلوم ہوا کہ کشتی میں سوراخ کرنا جو بظاہر شر اور مصیبت ہے عین حکمت اور اللہ کی رحمت ہے۔

آگے فرمایا:

﴿ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً وَكُفْراً، فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْراً مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْماً ﴾

''رہا وہ لڑکا تو اس کے والدین مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا، اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے میں ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو''۔

بڑی مصلحت پر چھوٹی مصلحت کو قربان کرنا، لڑکے کو قتل کرنا بظاہر شر ہے مگر اس سے بڑا اشر یہ ہے کہ اسے زندہ رکھا جائے کہ وہ بڑا ہو کر اپنے والدین کیلئے مصیبت کا باعث بنے گا مگر اس حکمت کو وقتی طور پر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

آگے فرمایا:

﴿ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِيْ الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ﴾

''اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں، اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں''۔

معلوم ہوا کہ باپ کی نیکی اس کے مرنے کے بعد اس کے بچوں کے بھی کام آتی ہے۔ باپ کی نیکی

کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو بطور خاص روانہ کیا جنہوں نے ان معصوم یتیم بچوں کے خزانے کی حفاظت کا انتظام کیا۔

ان تینوں واقعات سے جو سبق ملتا ہے وہ قرآن مجید کی اس آیت میں پنہاں ہے:

﴿ وَعَسَى أَن تَكْرَهُواْ شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّواْ شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ ﴾

''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو، بس اللہ جانتا، تم نہیں جانتے'' (23)۔

ہاں! اس حقیقت کا اگر ادراک ہوجائے کہ ''بس اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے'' تو ہم کئی مسائل سے بچ جائیں۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہم السلام کے اس واقعہ کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''کاش موسیٰ (علیہ السلام) اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی کچھ اور خبریں معلوم ہوجاتیں''۔

اس واقعے کے متعلق ایک اور دلچسپ پہلو پر غور کیجئے:

سفر کے دوران ایک چڑیا نے دریا میں اپنی چونچ ڈال کر پانی پیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

''اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرا، تیرا اور تمام مخلوقات کا علم بجز اس کے اور کچھ نہیں جتنا اس چڑیا نے اس دریا میں سے پانی لیا ہے'' (24)۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، ایک تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے، اگر اس کی حکمت ہمیں معلوم ہوجائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور نہ معلوم ہو تب صبر کریں۔

....

(23) البقرہ 216

(24) یہ تمام تفصیلات تفسیر کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حکمت وہ نور ہے جس سے الہام اور وسوسہ میں فرق کیا جا سکتا ہے ورنہ حکمت نہ ہو تو الہام اور وسوسہ میں فرق کیسے ہو سکتا؟۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ بڑا معروف ہے گو کہ اس کی سند پر اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عالی مقام صحرا کا سفر کر رہے تھے اور رات کا وقت تھا کہ اچانک زمین و آسمان کے درمیان ایک نور کا ہالہ نمودار ہوا اور ایک شخص تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے آواز دی:

''اے عبدالقادرؒ! میں تیرا رب ہوں، میں تجھ سے راضی ہوا ہوں اور تجھ پر وہ تمام چیزیں حلال کر دی ہیں جو لوگوں پر حرام کر رکھی ہیں''۔

حضرت عالی مقام نے فرمایا:

''کیا تم اللہ ہو جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں''۔

اس نے کہا:

''میں تیرا رب ہوں''۔

حضرت نے کہا:

''دور ہو، اے اللہ کے دشمن''۔

یہ کہنا تھا کہ نور کا ہالہ چھٹ گیا اور ابلیس نمودار ہوا، اس نے کہا:

''اے عبدالقادرؒ! یہ طریقہ اختیار کر کے میں نے کئی عالموں کو گمراہ کیا ہے، تم نے مجھے کیسے پہچان لیا''

حضرتؒ نے فرمایا:

اللہ زمین و آسمان کا نور ہے اور تیرا نور اس قدر محدود ہے''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرتؒ نے پوچھا کہ:

''کیا تم اللہ ہو جس کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

تو ابلیس ہاں نہ کہہ سکا بلکہ کہا کہ میں تیرا رب ہوں کیونکہ لفظ جلالہ ''اللہ'' کو خود رب سبحانہ وتعالیٰ نے تحفظ دیا ہوا ہے تو حضرت پہچان گئے کہ یہ ابلیس ہے۔

اب ابلیس نے حضرتؒ کو گمراہ کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا:

''اے عبدالقادرؒ! آج تیرے علم نے تجھے بچالیا ہے''۔

بظاہر یہ کتنی عام سی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس میں جو زہر ملا ہوا ہوا ہے اس کی طرف نگاہ بجز حکمت کے نہیں جاسکتی۔ حضرت شیخؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو حکمت عطا کر رکھی تھی، اس کی وجہ سے وہ شکر میں لپٹے ہوئے اس زہر کو محسوس کر رہے تھے، آپؒ نے جواب دیا:

''اے اللہ کے دشمن! مجھے میرے علم نے نہیں بلکہ میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے''۔

معلوم ہوا کہ شیطان کی اس مکارانہ چال کا مقابلہ کرنے کیلئے اس خیر کثیر کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے۔

ایک لطیف نکتے پر غور کریں کہ انسان کو دیگر مخلوقات پر جو شرف وفضیلت عطا ہوئی ہے وہ اس کی عقل کی وجہ سے ہے۔ یہ عقل نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس چیز کے باعث اللہ تعالیٰ نے انسان کو فضیلت دی اسی کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں۔ قرآن مجید کی کوئی آیت اور ذخیرۂ احادیث میں سے کوئی حدیث عقل کی فضیلت کے متعلق نہیں۔ قرآن کی آیات میں ''یعقلون، تعقلون'' تو ملے گا مگر اس کا مطلب غور وفکر وتدبر ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں عقل کی فضیلت کا کہیں ذکر نہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین نام ہے اتباع کا، دین کے بہت سے احکام اور بہت سے معاملات کو ہم اپنی عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے تو دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ میں سے کوئی نص صحیح عقلِ سلیم سے متصادم نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی چیز نہ مانگ جس کی عاقبت کا تمہیں معلوم

نہ ہو سوائے اس کے کہ اس میں خیر کا پہلو طلب کر، یعنی مستقبل کی کوئی چیز جس کے انجام کا ہمیں علم نہ ہو وہ چیز اللہ سے نہ مانگی جائے بلکہ اس میں خیر کا پہلو طلب کیا جائے اور شر سے بچنے کی دعا کی جائے جس طرح رسول اکرم ﷺ نے ہمیں استخارہ کی دعا میں سکھایا ہے۔

جب انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی معیت اس کے ساتھ ہوتی ہے اور وہی اس کے معاملات درست کرتی ہے۔ طائف کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے، وہاں آپ ﷺ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ سب کے علم میں ہے، واپسی کے وقت راستے میں عداس نامی ایک عراقی غلام ملا جو اسلام لے آیا، پھر جنات کی ایک جماعت ایمان لے آئی پھر اسراء و معراج کا واقعہ ہوا پھر انصار کا ایک گروہ اسلام لے آیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کمالِ تدبیر دیکھئے کہ آپ ﷺ طائف کو مرکز اسلام بنانا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت مدینہ منورہ تھی، آپ ﷺ اہل طائف کو اسلام کا پیغام پہنچانے گئے مگر اللہ تعالیٰ عراقی غلام کو یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا، رسول اکرم ﷺ تو انسانوں تک کو پیغام پہنچانے گئے مگر اللہ تعالیٰ جنات کو پیغام پہنچانا چاہتا تھا، رسول اکرم ﷺ اہل زمین سے ملنے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اہل آسمان سے ملوانا چاہتا تھا۔

حکمت کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمت دراصل حق کا علم حاصل کرنے، حق پر عمل کرنے، اس کا حکم دینے اور اس کی پاداش میں مصیبتوں پر صبر کرنے کا نام ہے۔

المجیب

اسماءُ الحسنیٰ کے اس مبارک سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب تک جن مبارک ناموں پر روشنی ڈالی گئی وہ یہ ہیں:

اللہ، الالہ، الرب، الرحمن، الرحیم، الحق، الجبار، الفتاح ، الرزاق و الرازق ، الوکیل اور الحکیم۔

اب ہم ایک اور مبارک نام پر روشنی ڈالنے جارہے ہیں جو سراسر رحمت اور امید ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے تمام مبارک نام سراسر رحمت ہیں مگر اب جو اسم مبارک پیش ہورہا ہے وہ سراسر رحمت کے ساتھ سراسرامید بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مبارک نام ''المجیب'' ہے، سورہ ہود، آیت 61 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِلٰی ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً،قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰـهٍ غَيْرُهُ، هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوۤاْ إِلَيْهِ،إِنَّ رَبِّی قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴾

''اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا، اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے''۔

صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''مشرکین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے اور ان اہم اسباب میں سے ایک ہے جنہوں نے ہر زمانہ میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں جو رعیت سے دور اپنے محلوں میں داد عیش دیا کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی، جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مقربینِ بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور پھر اگر خوش قسمتی سے کسی کی درخواست ان کے آستانۂ بلند پر پہنچ بھی جاتی ہے تو ان کا پندارِ خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کا جواب دیں بلکہ جواب دینے کا کام مقربین ہی میں سے کسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ رب کائنات کا آستانۂ قدس عام انسانوں کی دسترس سے بہت ہی دور ہے، اس کے دربار تک بھلا کسی عام آدمی کی پہنچ کیسے ہوسکتی ہے۔ وہاں تک دعاؤں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ پاک روحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے۔

یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور اللہ کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جم غفیر کھڑا کر دیا۔ قرآن نے جاہلیت کے اس پورے طلسم کو صرف دو لفظوں سے توڑ کر پھینک دیا ہے۔ ایک یہ ہے کہ اللہ قریب ہے، دوسرا یہ کہ وہ مجیب ہے۔ تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے، وہ تم سے دور ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ تم اس کو پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ وہ بہت بالا و برتر ہے مگر اس کے باوجود وہ تم سے بہت قریب ہے، تم میں سے ایک ایک شخص اس کو اپنے پاس پاسکتا ہے، اس سے سرگوشی کرسکتا ہے، خلوت وجلوت دونوں میں، علانیہ بھی اور صیغۂ راز میں بھی اپنی عرضیاں خود اس کے حضور پیش کرسکتا ہے۔ پھر وہ براہ راست اپنے ہر بندے کی دعاؤں کا جواب خود

دیتا ہے۔ پس جب سلطانِ کائنات کا دربارِ عام ہر وقت ہر شخص کیلئے کھلا ہے اور ہر شخص کے قریب ہی موجود ہے تو یہ تم حماقت میں پڑے ہوئے ہو کہ اس کیلئے واسطے اور وسیلے ڈھونڈتے پھرتے ہو''(1)۔

''المجیب'' کون ہے؟:

''المجیب'' وہ ہے جو پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔

اَلذِّیْ یُجِیْبُ مَسْئَلَةَ السَّائِلِیْنَ بِالْاِجَابَةِ وَالْعَطَاءِ

''وہ جو پکارنے والوں کی پکار کو سنتا ہے اور انہیں ان کی ضرورتیں عطا فرماتا ہے''۔

اگر ''المجیب'' ہماری پکار نہ سننا چاہتا ہو تو ہمیں لب ہلانے کی اجازت بھی نہ دیتا۔ اس نے دعا کیلئے لب ہلانے کی اجازت دی تو اس کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ ہماری پکار سننا چاہتا ہے۔ اس سے ''المجیب'' کا دوسرا مطلب نکلتا ہے، پہلا مطلب یہ تھا، وہ جو پکارنے والے کی پکار سنتا ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جو ہمارے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ اسے پکارا جائے۔ وہی ہے جو مانگنے والوں کے دلوں میں دعا کرنے کی رغبت ڈالتا ہے اور وہی ہے جو انہیں مانگنے کیلئے الفاظ بھی عطا کرتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے پھل کھانے کی خطا ہوئی، پھل کھانے کے بعد انہیں گناہ کا احساس ہوا مگر انہیں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اپنی خطا کی مافی مانگنے کیلئے کن الفاظ کا استعمال کریں۔ درجِ ذیل آیت ہم نے بار ہا پڑھی اور سنی ہے مگر اس پہلو کو مدنظر رکھ کر آیت کا مطالعہ کریں:

﴿ فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ،اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴾

''اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کرلیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

....

(1) تفہیم القرآن، سورہ ہود، حاشیہ 69۔

(2) البقرہ 37

وہ ''المجیب'' ہی تھا جس نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں دعا کے الفاظ تک ڈال دیئے۔ یہ بات لفظ '' تَلَقّٰی '' سے واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

''میں دعا کی قبولیت کی فکر نہیں کرتا بلکہ دعا کرنے کی فکر کرتا ہوں، اگر دعا میری زبان سے جاری ہوگئی تو جان لوں گا کہ قبولت بھی اس کے ساتھ ہے''۔

ایک بزرگ کہتے ہیں:

''مجھے اس بات کی فکر نہیں کہ میری دعا قبول ہوگی یا نہیں، مجھے تو اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں مجھ سے دعا نہ چھین لی جائے''۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ ، فُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ

''تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کیلئے تو رحمت کے دروازہ کھول دیئے گئے''(3)۔

''المجیب'' کون ہے؟:

''المجیب'' وہ ہے جس نے دعا کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ ''جب مجھے پکارو گے، اپنے پاس پاؤ گے''۔ اندازہ کریں کہ اگر دعا کا خاص وقت ہوتا، اگر دعا کیلئے قطار لگانا پڑتا، اس نے اپنی رحمت سے ایسا کچھ نہیں کیا۔ دعا کرنے والا صرف ہاتھ اٹھائے اور دعا کرے۔ ہاتھ اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں، دل سے دعا کرے، ''المجیب'' اس سے قریب ہے اور وہ اسے سن رہا ہے۔

''المجیب'' آپ کو اللہ کے باقی ناموں سے بھی قریب کر دیتا ہے، رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

....

(3) یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے جسے امام ترمذیؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے، دیکھئے: سنن ترمذی 3548، تاہم علامہ ناصر الدین الالبانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، دیکھئے: ضعیف الجامع 5720۔

اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَة

''دعاہی دراصل عبادت ہے''(4)۔

ہوسکتا ہے کہ آپ نماز پڑھ رہے ہوں مگر عبودیت کا آپ کو احساس نہ ہو، زکاۃ دے رہے ہوں مگر عبودیت کا احساس نہ ہو مگر دعا ایسی عبادت ہے جو عبودیت کا احساس دلاتی ہے۔آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اللہ کے تمام اسمائے حسنیٰ کا اقرار کرلیا۔آپ نے دعا کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اقرار کرتے ہیں کہ وہی عظیم ہے، وہی قوی ہے، وہی **الملک** ہے، وہی **السمیع** ہے، وہی **البصیر** ہے۔آپ نے ''**المجیب**'' کا اقرار کیا تو آپ نے تمام اسمائے حسنیٰ کا اقرار کرلیا۔ آپ نے ''**المجیب**'' کا اقرار کرتے ہوئے دعا کی تو آپ نے **السمیع و البصیر** کا اقرار کرلیا کیونکہ **السمیع و البصیر** سے لاکھوں افراد بیک وقت دعا کرتے ہیں اور سب کو یقین ہے کہ ''**المجیب**'' ان کو سن رہا ہے، انہیں دیکھ رہا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دو آدمیوں کے درمیان دعا پر جھگڑا ہوا ہو، کبھی کسی نے کسی سے نہیں کہا کہ ساری دعائیں تم نے مانگ لیں اور میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا، ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ کیونکہ ہر ایک کو یقین ہے کہ ''**المجیب**'' اسی کو سن رہا ہے اور اسے ہی دیکھ رہا ہے۔ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے درج ذیل عظیم آیت کی تلاوت کریں:

﴿ يَسْأَلُهُ مَن فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ ﴾

''زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اسی سے مانگ رہے ہیں، ہر آن وہ نئی شان میں ہے''(5)۔

مختلف زبانوں اور حاجتوں کے طالب لاکھوں کی تعداد میں بیک وقت اس کو پکارتے ہیں اور وہ

....

(4) حدیث صحیح: بروایت حضرت نعمان بن بشیرؓ، ابوداؤد 1479، ترمذی 3372۔

(5) الرحمٰن 29

سب کی زبان سمجھتا ہے، سب کی حاجت پوری کرتا ہے اور سب کو عطا کرتا ہے۔ پاک ہے وہ ہستی جو کسی ایک کی صدا سنتے ہوئے دوسرے کی پکار سے غافل نہیں ہوتی اور جس پر آوازیں خلط ملط نہیں ہوتیں۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالی کا فرمان ہے:

''اے میری بندو، اگر تم اول سے لے کر آخر انسان، تمام انس وتمام جن سب ایک میدان اکٹھے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر انسان کو اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کروں تو میرے خزانوں میں کمی نہیں ہوگی بجز ایسی جیسے سوئی کو سمندر میں ڈبو یا جائے'' (6)۔

''المجیب'' وہ ہے جو اپنے بندوں کو سخاوت سے عطا کرتا ہے:

﴿ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ وَلَيَزِيْد ﴾

''اللہ کے ہاتھ کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے'' (7)۔

اس لئے ''المجیب'' کو وہ لوگ زیادہ پسند ہیں جو دعا میں عاجزی، انکساری اور اصرار کرتے ہیں۔

''المجیب'' وہ ہے جو ایسے حالات پیدا کردیتا ہے کہ آدمی اس کے سامنے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہی ہے جو انسانوں کو ابتلا اور آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ اسے پکاریں، وہی بیمار کو بیماری کی حالت میں لے جاتا ہے تاکہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرے، وہی کشتی کو بھنور میں لے جاتا ہے تاکہ مسافر اسے پکاریں، وہی پوری امت کو ضعف اور کمزوری میں ڈالتا ہے تاکہ پوری امت اسے پکارے۔ اسے بندے کی پکار بڑی عزیز ہے جب بندہ ہاتھ اٹھا کر ''یارب، یارب'' کہتا ہے۔

''المجیب'' اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ اس سے مقفیٰ اور منمق دعا کی جائے۔ ضروری نہیں عربی میں دعا کی جائے، ایک آدمی کو پنجابی آتی ہے، وہ پنجابی میں دعا کرے، ایک آدمی ایسا ہے جسے افریقہ

....

(6) حدیث صحیح: بروایت حضرت ابوذر غفاریؓ، مسلم 2577، صحیح الجامع 4345

(7) المائدہ 64

کے جنگل میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ آتی ، وہ اسی زبان میں دعا کرے۔غرض عربی، پنجابی، اردو، تگالو،سواحلی اور دنیا کی کسی بھی زبان میں دعا کی جائے وہ اُس کی دعا کوسنتا ہےاوراس کی بات کو سمجھتا ہے۔ایک بدو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااورعرض کی:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ اور معاذؓ جس خوبصورت انداز میں جامع کلمات کے ساتھ دعا کرتے ہیں،اس طرح میں دعانہیں کرسکتا''۔

رسول اکرم ﷺ نے پوچھا:

''تو پھرتم کس طرح دعا کرتے ہو؟''۔

اس نے کہا''میں تو بس یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ مجھے جنت میں داخل کراور مجھے جہنم سے بچا''۔

گویا ایک دیہاتی آدمی کواس سے زیادہ مانگنے کا سلیقہ نہیں آتا،رسول رحمت ﷺ نے فرمایا:

میری اور معاذؓ کی دعا جتنی خوبصورت، جامع اور حسین کلمات پر مشتمل کیوں نہ ہومگر ہماری دعاؤں کا مرکز ومحور بھی یہی ہے جوتم اپنی دعامیں اللہ سے مانگتے ہو''(8)۔

قرآن مجید میں ہمیشہ''المجیب'' کا نام''القریب، کے ساتھ آتا ہے،ملاحظہ ہو:

﴿ فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّى قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴾

'' لہذا تم اس سے معافی چاہواوراس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے''(9)۔

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِى عَنِّى فَإِنِّى قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

''اوراے نبی ﷺ میرے بندے اگرتم سے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ دیں کہ میں ان سے قریب

....

(8)اس معانی اور مفہوم کی متعدد روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں، دیکھئے:ابوداؤد 792

(9)ہود 61

ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہے'' (10)۔

آپ کسی ایسی ہستی کو نہیں پکار رہے جو بہت دور ہو اور ہماری پکار نہ سن سکتا ہو۔ آپ ایسی ہستی کو پکارتے ہیں جو بہت قریب ہے۔ ایسا قرب جس سے زیادہ قریب کا تصور نہیں کیا جا سکتا:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾

''ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں، ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں'' (11)۔

ہم جب اپنا معاملہ کسی کے سامنے پیش کرتے ہیں تو پورا مسئلہ تفصیل کے ساتھ اس کے پس منظر کو واضح کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں مگر جب اللہ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرتے ہیں تو تفصیل اور پس منظر کیوں نہیں بتاتے؟ کیونکہ وہ قریب ہے، بہت قریب ہے، اسی لئے تمام کائنات اسی کو پکارتی ہے اور وہ ان کی پکار کو سنتا ہے۔

﴿ يَسْأَلُهُ مَن فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ ﴾

''زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اسی سے مانگ رہے ہیں، ہر آن وہ نئی شان میں ہے'' (12)۔

اسی لئے المجیب کو یہ بات پسند ہے کہ آپ ہر چیز اس سے مانگیں، اسی سے سوال کریں۔ صرف بڑے اور مشکل مسائل میں ہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اسی سے مانگیں کیونکہ وہ ''المجیب'' ہے، نہ صرف ''المجیب'' ہے بلکہ وہ ''القریب'' بھی ہے۔

....

(10) البقرہ 186

(11) ق 16

(12) الرحمٰن 29

ایک اعرابی رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

اَبَعِیْدٌ رَبُّنَا فَنُنَادِیْهِ اَمْ قَرِیْبٌ فَنُنَاجِیْهِ ؟

''ہمارا رب دور ہے کہ اسے پکارنے کیلئے آواز بلند کریں یا ہم سے قریب ہے کہ ہم سرگوشی کریں تو وہ سن لیتا ہے؟''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیار کی، کیوں؟ اس لئے اس سوال کا تعلق رب سبحانہ وتعالیٰ سے ہے اور وہی اس کا جواب دے گا، اللہ تعالی نے آیت نازل کی:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَإِنِّیْ قَرِیْبٌ،أُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾

''اور (اے نبی ﷺ)! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں''(13)۔

آیت مذکورہ میں کتنی محبت ہے، کتنا لطف ہے، کتنا براہ راست تعلق ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ نہیں کہا کہ مومن اگر میرے بارے میں پوچھیں بلکہ فرمایا ''عبادی''، یعنی میرے بندے، میرے وہ بندے جو مجھ پر ایمان لاتے ہیں اور میری اطاعت کرتے ہیں اور میرے وہ بندے بھی جو میری نافرمانی کرتے ہیں، پھر فرمایا'' جب مجھے پکارتا ہے'' یعنی معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے پکارو تو میری تمہاری پکار سنوں گا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ،إِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ﴾

''تمہارا رب کہتا ہے، مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری

---

(13) البقرہ 186، دیکھئے: تفسیر القرآن از حافظ ابن کثیرؒ، جامع البیان فی تفسیر القرآن، از علامہ طبریؒ

عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے'' (14)۔

جو لوگ دعا نہیں کرتے انہیں گھمنڈی قرار دیا۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ

''جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے'' (15)۔

اس غضبنا کی کی وجہ کیا ہے؟

اس لئے کہ کون ہے جو اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور انہیں قبول کرتا ہے سوائے رب ذو الجلال کے۔ جو آدمی دعا نہیں کرتا گویا وہ نیاز ہو گیا، کیا کوئی انسان کبھی بے نیاز ہو سکتا۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْى اِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ اِلَيْهِ يَدَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْن

''اللہ حیا دار ہے، اسے حیا آتی ہے کہ بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھائے اور وہ اسے خالی ہاتھ لوٹا دے'' (16)۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا رب جو المجیب ہے وہ کتنا کریم ہے۔ وہ حیا دار ہے، اسے حیا آتی ہے کہ اس کا بندہ ہاتھ اٹھا کر یا رب یا رب کہے اور رب سبحانہ وتعالیٰ اسے خالی ہاتھ لوٹا دے۔

قرآن مجید میں مذکور انبیاء کے قصص کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ <u>ہمیشہ مشکل دعاؤں کو قبولیت کا ذکر ہمیں ملتا ہے</u>۔ مراد یہ کہ ہمارے پیمانوں کے مطابق مشکل اور ناممکن دعائیں۔ دیکھئے

---

(14) غافر 60

(15) حدیث حسن: بروایت حضرت ابو ہریرہؓ، صحیح ترمذی 3373

(16) حدیث صحیح: بروایت حضرت سلمان فارسیؓ، صحیح الجامع 1757

قرآن مجید میں کہاں کہاں **فَاسْتَجَبْنَا له** یعنی ہم نے اس کی دعا یا پکار سن لی، کا ذکر ہوا ہے:

حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے ہیں، بیوی بھی بانجھ ہے، دعا کرتے ہیں:

﴿ **ذِکْرُ رَحْمَةِ رَبِّکَ عَبْدَه زَکَرِیَّا، إِذْ نَادَی رَبَّهُ نِدَاء خَفِیّاً** ﴾

''ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔''

اندازہ کیجئے، رات کی تاریکی ہے، کوئی سننے والا نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام چپکے چپکے مناجات کر رہے ہیں:

﴿ **قَالَ رَبِّ إِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَیْباً** ﴾

''اس نے عرض کیا: اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے''۔

گویا زمینی حقیقت واضح کر رہے ہیں، زمینی حقیقت کہتی ہے کہ جس آدمی کی ہڈیاں گھل چکی ہوں وہ عمر کے اس حصے میں ہوتا ہے جہاں کچھ نہیں ہو سکتا، مگر حضرت زکریا علیہ السلام کو زمینی حقیقت کے علاوہ ایک اور حقیقت کا بھی یقین تھا، وہ تھی آسمانی حقیقت۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ میری ہڈیاں گھل چکی ہیں اور آسمانی حقیقت کا یقین ہے کہ:

﴿ **وَلَمْ أَکُنْ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیّاً** ﴾

''اے پرورد گار، میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا'' (15)۔

اے رب! میں نے زندگی بھر تجھ سے جو کچھ مانگا، تو نے مجھے عطا کیا، تجھ سے مانگ کر میں کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ساری حقیقتیں اپنی جگہ اور تیری عطا اپنی جگہ، دیکھئے اب مانگ کیا رہے ہیں:

﴿ **وَکَانَتِ امْرَأَتِیْ عَاقِراً فَهَبْ لِیْ مِن لَّدُنکَ وَلِیّاً** ﴾

....

(15) مریم 2، 4

''اور میری بیوی بانجھ ہے، تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر'' (16)۔

حضرت زکریا علیہ السلام کو یقین تھا کہ اللہ سے مانگنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا، اس لئے فوری طور پر دعا قبول ہوتی ہے:

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيٰى ﴾

''ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحیٰ عطا کیا'' (17)۔

حضرت یونس علیہ السلام نے سمندر کی گہرائیوں سے پکارا:

﴿ فَنَادٰى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ ﴾

''آخرکو اس نے تاریکیوں سے پکارا: نہیں ہے کوئی معبود مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا'' (18)۔

حضرت یونس علیہ السلام پر 3 تاریکیاں جمع ہوگئیں، رات کی تاریکی، سمندر کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، ان تاریکیوں میں وہ المجیب کو پکارتے ہیں تو فوری طور المجیب انہیں جواب دیتا ہے:

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ﴾

''ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی'' (19)۔

اے رب ذوالجلال! یہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ تیرا فضل خاص تھا یا ہم بھی اسی طرح کی دعا کریں تو تُو ہمیں بھی مشکلات سے نجات دے گا:

....

(16) مریم 5

(17) الانبیاء 90

(18) الانبیاء 87

(19) الانبیاء 88

﴿ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچالیا کرتے ہیں''(20)۔

معلوم ہوا کہ قیامت تک اہل ایمان میں سے جو بھی اخلاص اور یقین کے ساتھ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا کرے گا، اسے اسی طرح مشکل سے نجات ملے گی جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو ملی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی پکار سنئے:

﴿ وَلَقَدْ نَادَانَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴾

''ہم کو نوح نے پکارا، دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے''(21)۔

ہمارا رب قریب بھی ہے اور مجیب بھی، اس کے نزدیک کوئی کام مشکل نہیں۔ اخلاص اور یقین کے ساتھ اسے پکارنے والا کبھی خائب وخاسر اور نامراد نہیں لوٹتا۔

حضرت ابن عمرؓ کا کہنا ہے:

''مجھے معلوم ہے کہ میری دعا کب قبول ہوتی ہے!''۔

لوگوں نے کہا: وہ کیسے؟۔

فرمایا:

''جب دل میں خشوع طاری ہو، اعضا پر ارتعاش پیدا ہو، آنکھیں نم ہو جائیں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قبولیت دعا کا وقت ہے''۔

حضرت امام احمد بن حنبل کا کہنا ہے:

''تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری دعا کن حالات میں قبول ہوتی ہے۔ فرض کرلو ایک مسافر کشتی پر سمندر

....

(20)الانبیاء88

(21)الصافات75

کا سفر کر رہا تھا، طوفان آیا اور اس کی کشتی ٹوٹ کر غرق ہوگئی، اس کے ہاتھ میں کشتی سے ٹوٹنے والا کوئی لکڑی کا تخت ہے جس کو تھامے وہ موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے، موجیں اسے اوپر اٹھاتی ہیں اور نیچے گراتی ہیں، وہ لکڑی کے تخت کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی کوشش کرتا ہے، وہ رات کی تاریکی اور سمندر کی وسعت میں ہے، اس حالت میں وہ دل کی اتاہ گہرائیوں سے پکارتا ہے: یارب، یارب''۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں:

''اس کیفیت کو اگر طاری کر کے تم بھی رب کو پکارو تو تمہاری دعا کبھی رد نہ ہوگی''۔

ہمارا رب المجیب ہے، وہ ہماری پکار نہ صرف سنتا ہے بلکہ ہماری ضرورتوں کو پورا بھی کرتا ہے۔

التواب

اسماءُ الحسنٰی کے اس مبارک سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب تک جن مبارک ناموں پر روشنی ڈالی گئی وہ یہ ہیں:

اللہ، الالٰہ، الرب، الرحمن، الرحیم، الحق، الجبار ،الفتاح ، الرزاق و الرازق ، الوکیل، الحکیم اور المجیب۔

اس سلسلے میں مزید آگے بڑھتے ہوئے ایک اور مبارک نام پر روشنی ڈالتے ہیں اور وہ مبارک نام ہے ''التواب'' ۔ یہ نام خصوصی طور پر ان لوگوں کیلیئے ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم وزیادتی کی ہے۔ یہ نام انہیں دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دامن رحمت بہت وسیع ہے، انہیں پلٹ آنا چاہئے ،قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ أَلَمْ يَعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾

''کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے صدقات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے'' (1)۔

توبہ کے اصل معنیٰ رجوع کرنے اور پلٹ آنے کے ہیں۔ بندے کی طرف سے توبہ کے معنیٰ یہ ہیں

....

(1)التوبہ 104

کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا، طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہوگئی(2)۔

گناہ کے بعد بندے کا اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا، اب اپنے کئے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔

قرآن مجید اس نظریئے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہوں گے۔ یہ انسان کے خودساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کن نظریہ ہے کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہ گارانہ زندگی میں مبتلا ہوگیا، اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کیلئے مایوس کر دیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابقہ گناہوں کی تلافی اور آئندہ کیلئے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے اور چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے، وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں کہ لازماً مرتب ہو کر ہی رہے بلکہ اللہ تعالیٰ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے(3)۔

"التواب" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو اپنے پشیمان بندے کی پشیمانی کو قبول کرتے ہوئے اس کے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔ وہ اپنے شرمسار بندے کی طرف رحمت سے متوجہ ہوتا ہے اور اپنی نظر عنایت اس کی طرف مائل کرتا ہے۔ زیرِ مطالعہ آیت کو دیکھئے:

﴿ أَلَمْ يَعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾

(2) تفہیم القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(3) تفہیم القرآن 1/68

''کیاان لوگوں کومعلوم نہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جواپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے'' (4)۔

مطلب یہ ہے کہ غلطی اور قصور سرزد ہوجائے تو سچے دل سے پلٹ آنے والے کیلئے ضمانت ہے کہ اس کی پشیمانی اوراعترافِ جرم اسے قبولیت سے نواز دے گی۔

غلطی سرزد ہونے پرعذر پیش کرنے والے کیلئے 3 حالتیں ہیں:

*یاتو وہ کہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔

*یاوہ کہے کہ مجھ سے جرم سرزد ہوگیااوراس کی وجہ یہ تھی۔

*یا پھر وہ کہے کہ ہاں مجھ سے غلطی ہوگئی، میں اپنے غلطی پر پشیمان ہوں اور آئندہ نہ کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

توبہ یہی تیسری صورت ہے،رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''توبہ درحقیقت پشیمانی ہے'' (5)۔

علامہ راغب اصفہانیؒ کہتے ہیں:

شرع میں توبہ کا مطلب گناہ کو قبیح جانتے ہوئے چھوڑ دینا، گزشتہ پر نادم وپشیماں ہونا، آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنااوراس گناہ کے مابعد اثرات کوزائل کرنے کیلئے نیک اعمال کرنا(6)۔

مولانا تھانویؒ کہتے ہیں:

''توبہ نصوح دل کے اعمال میں سے ایک عمل ہے یعنی دل کوگناہ سے پاک کرنا۔اس کی علامت یہ ہے کہ بندہ اس گناہ سے نفرت کرے،اتنی نفرت کہ وہ گناہ کرنے کا دوبارہ تصور تک نہ کرے۔''

....

(4)التوبہ 104

(5)حدیث صحیح: ابن ماجہ،احمد وحاکم

(6)مفردات الراغب

توبہ کی 2،3اور 4 قسمیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بتائی گئیں:

*توبہ انابت: اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت کی وجہ سے گناہ ترک کرنا۔

*توبہ استجابت: اللہ تعالیٰ کے حاضر ناظر اور شہ رگ سے قریب ہونے کے تصور سے اس سے حیا کرتے ہوئے گناہ کو ترک کرنا۔

* صحیح توبہ: جب بندے سے گناہ سرزد ہوجائے تو فوری طور پر صدقِ دل سے توبہ کرے۔

*اصح توبہ: توبہ نصوح ہے۔

*فاسد توبہ: زبان سے توبہ جبکہ دل میں گناہ کی لذت باقی رہے۔

قرآن مجید میں توبہ کے تین استعمالات ہوئے:

1) توبہ بمعنیٰ درگزر کرنا اور معاف کرنا:

قرآن مجید میں اس کا ذکر ہمیشہ ''علیٰ'' کے ساتھ ہوتا ہے، مثال کے طور پر:

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِکَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ،وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْماً حَكِيْماً ﴾

''ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کیلئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر سے متوجہ ہوجاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے'' (7)۔

یہاں توبہ کے ساتھ ''علیٰ'' آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ درگزر کرنا اور معاف کرنا۔

2) توبہ بمعنیٰ واپس آنا اور پلٹ آنا: قرآن مجید میں اس کا ذکر ہمیشہ ''الی'' کے ساتھ ہوتا ہے، مثال کے طور پر:

....

(7) النساء 17

﴿ ......فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾

''اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے، اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کرلی'' (8)۔

یہاں ''الیٰ'' آیا ہے۔''اپنے خالق کے حضور توبہ کرو۔'' کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے خالق کے حضور واپس آؤ اور پلٹ آؤ۔

3) توبہ بمعنی ندامت، پشیمانی اور شرمساری: اس کا ذکر نہ ''الیٰ'' کے ساتھ ہوگا نہ ''علی'' کے ساتھ، مثال کے طور پر:

﴿ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

''اب اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے'' (9)۔

یعنی اگر تم ندامت اور شرمساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف واپس آؤ۔

توبہ کس کیلئے ہے؟:

توبہ صرف گناہگاروں، مجرموں اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے ہی نہیں بلکہ یہ تمام انسانوں حتیٰ کہ مومنوں کیلئے بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَد تَّابَ اللهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ...... ﴾

''اللہ نے معاف کردیا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور ان مہاجرین وانصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیا'' (10)۔

....

(8) البقرہ 54

(9) التوبہ 3

(10) التوبہ 117

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

''اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے'' (11)۔

اسی طرح انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کی توبہ کا بھی ذکر ہے:

* ''اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی'' (12)۔

* ''اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے...... ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما (یعنی توبہ قبول کر'' (13)۔

* ''جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا...... میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں'' (14)۔

یہ اور اس کی طرح دیگر آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ توبہ کرنا انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء اور مرسلین علیہم السلام نے لوگوں کو توبہ کرنے کی دعوت دی، چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

* ''اور عاد کی طرف ہم نے ہود کو بھیجا...... اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو پھر اس کی طرف پلٹو'' (15)۔

* ''اور ثمود کی طرف ہم نے صالح کو بھیجا..... تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ'' (16)۔

....

(11) النور 31

(12) البقرہ 37

(13) البقرہ 127، 128

(14) الاعراف 143

(15) ہود 50، 52

(16) ہود 61

*''انہوں نے جواب دیا، اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے......دیکھو، اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ'' (17)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے، کہتے ہیں:

''ہم ایک مجلس میں آپ ﷺ کا ذکر شمار کرتے تھے، وہ ایک مجلس سے اٹھنے سے پہلے سو مرتبہ کہا کرتے تھے: اے میرے رب مجھے معاف کردے، میری توبہ کر، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے'' (18)۔

جبکہ رسول اکرم ﷺ کا اپنے بارے میں ارشاد ہے:

''اللہ کی قسم! میں ایک دن میں 70 سے زیادہ مرتبہ استغفار اور توبہ کرتا ہوں'' (19)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیں توبہ واستغفار کی دعوت دیتا ہے:

''پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے'' (20)۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے گناہ ناقابل معافی ہوں۔ ہم نے توبہ کے دروازے کے بارے میں سن رکھا ہے، آخر یہ توبہ کا دروازہ کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ نے جب زمین وآسمان کی تخلیق کی تو مغرب کی سمت ایک دروازہ بنایا، اُس دروازے کی چوڑائی ایسی ہے جیسے ایک سوار 70 سال تک سفر کرتا رہے''۔

حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں:

....

(17) ھود 84-90

(18) امام ترمذی نے اسے ''حدیث حسن غریب'' کہا ہے

(19) حدیث صحیح: بخاری مع الفتح

(20) المائدہ 74

''یہ توبہ کا دروازہ ہے، اس وقت تک بند نہیں ہو گا جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو'' (21)۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا ہے جس کے گناہ اس دروازے سے نہ گزر سکتے ہوں؟ ہمارا رب تو ہم پر ہماری ماؤں اور ہمارے باپوں سے بھی زیادہ شفقت و رحم فرمانے والا ہے اور اس کی رحمتوں کی وسعت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ہر کسی کیلئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ کوئی چاہے کتنا ہی کفر و شرک کیوں نہ کر چکا ہو اور کتنی ہی سرکشی و تکبر میں مبتلا رہا ہو، رحمت کے دریا اس کے لئے بھی ٹھاٹھیں مار رہے ہیں اور توبہ کے دروازے اس کیلئے بھی کھلے ہیں۔

اُس ضعیف العمر بوڑھے کو ہی دیکھ لیں جس کی کمر کِبر سنی کی وجہ سے جھک گئی ہے اور ہڈیاں تک کمزور ہو چکی تھیں، وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے اور وہ اپنے قدموں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے آ رہا تھا، اس کے ابرو اس کی آنکھوں پر گر چکے تھے اور وہ اپنے عصا پر ٹیک لگائے پیدل چلتا ہوا حاضر خدمت ہوا۔ اس نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی المناک اور درد بھری آواز سے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اس شخص کے بارے میں آپ (ﷺ) کیا فرماتے ہیں جس نے ہر قسم کے گناہ کئے ہوں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑا ہو اور کسی صغیرہ تو کیا کسی کبیرہ سے بھی کبھی ہاتھ نہ کھینچا ہو اور اگر اس کے گناہوں کو روئے زمین کے تمام لوگوں پر تقسیم کر دیا جائے تو وہ سبھی کو ڈبو دیں، کیا اُس شخص کیلئے بھی توبہ کا کوئی موقع ہے؟

نبی اکرم ﷺ نے اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا شخص ہے جس کی کمر جھک چکی ہے، سانسیں اکھڑ چکی ہیں، ماہ و سال کی گردش نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے اور شہوت رانیوں کے بعد آلام و مصائب نے اسے ہلاک کر رکھا ہے۔

....

(21) حدیث حسن، بروایت سیدنا صفوان بن عسالؓ، **الصحیح المسند، الوادعی۔**

نبی اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا ''کیا تم مسلمان ہو چکے ہو؟''۔

اس نے عرض کیا:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور آپ (ﷺ) اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں''

اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نیکی و بھلائی کے کام کیئے جاؤ اور برائیاں چھوڑ دو، اللہ تمہارے پچھلے تمام گناہوں کو تمہارے لئے نیکی و بھلائی بنا دے گا۔''

اس عمر رسیدہ شخص نے عرض کیا:

''اور میری دغا بازیاں و غلط کاریاں بھی بخش دے گا؟

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''ہاں۔''

اس بوڑھے شخص نے زور زور سے تکبیریں بلند کرنا شروع کر دیں اور کہا: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، وہ اسی طرح بلند آواز سے تکبیریں کہتا رہا حتیٰ کہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا(22)۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے ملکوں میں بعض مخصوص طبقہ نے توبہ کو انتہائی غلط انداز میں پیش کر کے لوگوں کو توبہ سے ہی خائف کر دیا ہے۔اس مخصوص طبقہ نے توبہ کے متعلق یہ رائج کر رکھا ہے کہ جو آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اسے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کیونکہ توبہ توڑنے پر اسے سخت سزا ملے گی۔ یہ خیال توبہ کی بنیادی حقیقت کے منافی ہے۔توبہ کی حقیقت ہمیں رسول اکرم ﷺ کی درج ذیل حدیث سے ملتی ہے:

ایک آدمی نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا:

....

(22)حدیث صحیح : حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ یہ صحیح بخاری کی شرط پر پوری اترنے والی سند ہے، مزید دیکھئے: ترغیب وترھیب، مجمع الزوائد۔

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ہم میں سے کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ گناہ اس پر لکھا جائے گا''۔

اس نے کہا: ''پھر وہ نادم ہوکر معافی چاہے اور توبہ کرلے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس کا گناہ معاف کر دیا جائے اور توبہ قبول کرلی جائے گی''۔

معلوم ہوا جو آدمی صدق دل سے نادم ہوکر توبہ کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے اسے معاف فرمادے گا۔ اس آدمی نے پھر سوال کیا: ''پھر وہ واپس گناہ کرتا ہے''۔

یعنی توبہ توڑ دیتا ہے اور گناہ سے آلودہ ہوجاتا ہے، اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس پر لکھا جائے گا۔''

یعنی اگر توبہ کے بعد پھر وہ گناہ کرتا ہے تو اس پر ویسے ہی لکھا جائے گا جس طرح عام حالات میں گناہ کے ارتکاب پر لکھا جاتا ہے۔ وہ آدمی پھر پوچھتا ہے:

''پھر وہ نادم ہوکر معافی چاہے اور توبہ کرلے تو''۔

یعنی توبہ توڑ کر پھر توبہ کرے، اس صورت میں کیا ہوگا؟ آیا اس کی توبہ قبول ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پھر اس کو معاف کر دیا جائے اور توبہ قبول کرلی جائے گی''۔

اور قبل اس کے کہ وہ آدمی تیسری مرتبہ سوال کرتا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم توبہ کرنے سے اکتا جاؤ تو اکتا جاؤ مگر اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے سے کبھی نہیں اکتا'' (23)۔

....

(23) حدیث حسن: طبرانی نے اوسط اور کبیر میں روایت کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنا دامن پھیلائے ہماری منتظر ہے:

''اللہ تعالیٰ رات کو اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے تا کہ دن کو گناہ کرنے والا توبہ کرلے اور دن کو ہاتھ پھیلاتا ہے تا کہ رات کو گناہ کرنے والا توبہ کرلے، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے یہاں تک سورج مغرب سے طلوع ہوجائے'' (24)۔

ایک محبت بھری حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے ابن آدم! تو اگر مجھ سے مانگے اور مجھ سے امید رکھے تو میں تیرے سارے گناہ معاف کردوں، خواہ جتنے بھی ہوں، مجھے اس کی پروانہیں، اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگ جائیں اور تو مجھ سے معافی چاہے تو تجھے معاف کردوں گا، مجھے اس کی پروانہیں۔ اے ابن آدم! اگر تو زمین بھر گناہ میرے پاس لے آئے مگر میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے تو میں اس کی مقدار تجھے معافی دے دوں، مجھے اس کی پروانہیں'' (25)۔

انتہائی خوبصورت اثر ہے:

''اے داؤد، مجھ سے منہ موڑنے والوں کو اگر معلوم ہوجائے کہ میں ان کے رجوع کرنے کا کتنا مشتاق ہوں تو وہ مجھ سے ملنے کے اشتیاق میں پگھل گئے ہوتے۔''

غور کریں کہ اشتیاق منہ موڑنے والوں کیلئے ہے۔

''اے داؤد! مجھے، مجھ سے منہ موڑنے والوں سے اتنی محبت ہے...... تو (اندازہ کرکہ) میری اطاعت کرنے والوں سے مجھے کتنی محبت ہوگی۔''

اثر میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

....

(24)حدیث صحیح: مسلم

(25)ترمذی، ترغیب وترھیب

''میرا اور اِنس وجن کا عجیب معاملہ ہے۔ میں انہیں پیدا کرتا ہوں، عبادت وہ کسی اور کی کرتے ہیں، میں انہیں رزق دیتا ہوں، شکر وہ کسی اور کا بجالاتے ہیں، میری طرف سے خیر ہی خیر ان کی طرف اترتا ہے، ان کی طرف سے شر ہی شر میں میری طرف آتا ہے، میں (پھر بھی) اپنی رحمت سے ان کی دلجوئی کرتا ہوں حالانکہ میں تو ان سب سے بے نیاز ہوں، وہ گناہوں کا ارتکاب کر کے مجھ سے دور ہورہے ہیں حالانکہ انہیں میری سب سے زیادہ ضرورت ہے، میرا ذکر کرنے والے میرے ہم نشین ہیں، میری اطاعت کرنے والے میرے محبوب ہیں، پھر بھی میری معصیت کرنے والے (گناہگاروں) کو میں اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا، اگر وہ توبہ کریں تو میں ان کا محبوب ہوں اور وہ (گناہوں سے) دور رہیں تو میں ان کا طبیب ہوں، میں انہیں مصیبتوں میں ڈال کر انہیں گناہوں سے پاک کرنا چاہتا ہوں، ان میں سے جو توبہ کر کے رجوع کر لے تو میں دور سے دوڑتا ہوا اس کے پاس آتا ہوں اور جو اعراض کرتا ہے تو میں اس کے قریب جا کر اسے بلاتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں ...... کہاں جاتے ہو، کیا میرے سوا تمہارا کوئی اور رب ہے''۔

ایک اور اثر میں آیا ہے:

''اے ابن آدم! گناہ پر تذلل وانکساری کرنا ہمارے نزدیک اس فرمانبرداری سے زیادہ محبوب ہے جس میں دکھاوا ہو، اے ابن آدم! گناہگاروں کی آہ وبکا ہمارے نزدیک دکھاوا کرنے والوں کی تسبیح سے زیادہ محبوب ہے۔''

ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا رب رحیم ہے، وہ کریم ہے، وہ التواب ہے، ہم جب جب توبہ کریں، وہ ہماری توبہ قبول کرتا ہے۔ جب ابلیس کو راندۂ درگاہ کیا گیا اور اسے ملعون قرار دے کر رحمت الٰہی سے دور کر دیا گیا تو اس نے قسم کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا:

''قسم ہے تیری عزت وجاہ وجلال کی، میں تیر بندوں کو بھٹکاتا رہوں گا جب تک ان کی جان میں

جان ہے''۔

یعنی یہ انسان جس کی خاطر تو نے مجھے ملعون قرار دے کر راندۂ درگاہ کیا ہے، میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا، میں اسے اس وقت تک گمراہی کے راستے پر لاتا رہوں گا جب تک اس کی جان میں جان ہے۔اس پر ہمارے رب کریم ورحیم اور تواب نے فرمایا:

''مجھے قسم ہے اپنی عزت وجاہ وجلال کی۔''

یعنی تو میری عزت وجاہ وجلال کی قسم کیا کھاتا ہے، مجھے اپنی عزت وجاہ وجلال کی قسم ہے:

''میں انہیں معاف کرتا رہوں گا جب جب بھی وہ مجھ سے معافی چاہیں گے''۔

اس کے بعد بھی ہم توبہ کرنے والے نہ بنیں تو ہم سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا۔

التواب وہ ہے جو گنہگار بندے کو توبہ کرنے کی توفیق دیتا ہے:

''اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کیلئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے''(26)۔

''الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو، ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں میں بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے، جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے''(27)۔

....

(26)التوبہ118

(27)الفرقان70،71